فصلنامه
راہ اسلام

شمارہ : ۱۸۱ - جولائی تا ستمبر ۲۰۰۱ء

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلیشر

محمد حسن مظفری

خانۂ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران۔ ۱۸، تلک مارگ، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۱

فون: ۳۳۸۳۲۳۲-۳۴

فیکس: ۳۳۸۷۵۴۷

http://www.iranhouseindia.com

E-mail:mozafarihasan@yahoo.com

ادارتی ودیگر معلومات کے لئے مندرجہ ذیل پتہ پر بھی رابطہ قائم کیا جاسکتا ہے۔

خانۂ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران ۳۳۔ مہارشی کروے روڈ (ایم۔ کے۔ روڈ) بالمقابل چرنی روڈ، ریلوے اسٹیشن۔ بمبئی

٭ہمکاران مجلّہ:

٭تزئین کار: مجید احمدی

٭کتابت : قاری محمد یاسین

٭ناشر :خانہ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران

۱۸۔ تلک مارگ۔ نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۱

راہ اسلام میں شائع ہونے والے ہر مقالے کا اسلامی جمہوریہ ایران کے نظریات کا مظہر ہونا لازمی نہیں۔

فہرست

	موضوعات		صفحہ
۱	اداریہ:اسلام اور دہشت گردی		۴
۲	ظلم و نسل پرستی کی ممنوعیت کا قانون	از: محمد حسن مظفری	۸
۳	اسلامی حکومت کے مقاصد	از: مصطفیٰ اربابی	۱۶
۴	ملاقات و گفتگو	از: وائس چانسلر شاہد مہدی	۳۷
۵	تہران میں عالمی کانفرنس سے خطاب	از: حجت الاسلام سید محمد خاتمی	۴۴
۶	کانفرنس سے خطاب	از: آیت اللہ خامنہ ای	۵۴
۷	عزاداری امام حسینؑ	از: پروفیسر عزیز الدین	۷۴
۸	شعر	از: دبیر سیتاپوری	۱۰۳
۹	مسئلہ فلسطین اور ملت اسلامیہ عالم	از: ڈاکٹر اختر مہدی	۱۰۴
۱۰	دھخدا اور فارسی ادب	از: فخر عالم	۱۱۴
۱۱	حضرت فاطمہ زہرا	از: ڈاکٹر اختر مہدی	۱۱۹
۱۲	قرآن اور نہج البلاغہ	از: پروفیسر شاہ وسیم	۱۳۲
۱۳	مسلمانوں کے خلاف پروپگنڈہ…	از: آیت اللہ سید علی خامنہ ای	۱۵۲

اداریــــــہ:

اسلام اور دہشت گردی

اار ستمبر کو نیویارک اور واشنگٹن میں رونما ہونے والے حوادث گوناگوں پہلوؤں کے حامل ہیں جن کا مختلف زاویۂ نظر سے مطالعہ و تجزیہ کیا جاسکتا ہے۔ ابتدائی ایام میں بعض مغربی اور صہیونی وسائل ابلاغ عامہ نے امریکی حوادث کو اسلام اور مسلمانوں سے جوڑنے کی بھرپور کوشش کی لیکن انہیں مایوسی کے علاوہ کچھ حاصل نہ ہوسکا اور وہ لوگ بہت جلد ہی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اس جھوٹے اور بے بنیاد پروپگنڈے کے برے آثار و نتائج کی طرف متوجہ ہوگئے تہذیبوں اور تمدنوں کے درمیان ٹکراؤ اور عداوت کا نظریہ انتہائی خطرناک نتائج کا حامل ہے اور اگر ناعاقبت اندیشی سے کام لیتے ہوئے مغربی اور صہیونی تبلیغاتی اداروں نے اس فلسفہ و نظریہ کی تبلیغ واشاعت کا سلسلہ شروع کیا تو عالمی امن وسلامتی کا شیرازہ منتشر ہو جائے گا۔ باہمی صلح وسلامتی کے ساتھ زندگی بسر کرنے والوں کا قافلہ درحقیقت باہمی صبر و تحمل اور بردباری کے راستہ سے گزرتا ہے۔ دنیا میں مختلف عظیم اقوام و تمدن موجود ہیں جن کے پاس اس کے علاوہ کوئی دوسرا چارہ کار نہیں ہے کہ وہ آپسی میل جول اور باہمی مفاہمت و ہم آہنگی کے ساتھ زندگی بسر کریں لہٰذا "تمدنوں کے درمیان ٹکراؤ" جیسے فلسفہ کے مقابلے میں "تمدنوں کے درمیان گفتگو" کا فلسفہ عالمی صلح وسلامتی اور موجود دنیا کی حقیقتوں سے زیادہ قریب اور ہم آہنگ ہے۔ لہٰذا

مذہب اسلام، اسلامی تہذیب وتمدن اور دنیا کے ہر گوشے میں زندگی بسر کرنے والے مسلمانوں پر الزام واتہام لگانے سے کوئی فائدہ حاصل ہونے والا نہیں ہے البتہ عالمی صلح وسلامتی کے لئے خطرہ ضرور پیدا ہو جائے گا۔

فارسی زبان میں ایک کہاوت مشہور ہے کہ ''ہوا بونے والا طوفان ہی کاٹتا ہے۔'' پس جو لوگ دوسری اقوام کے خلاف نفرت وحقارت کی ترویج میں سرگرم ہیں وہ درحقیقت تشدد اور شدت پسندی پیدا کر رہے ہیں اور یہ بات عالمی انسانی برادری کے فائدہ میں ہرگز نہیں ہے کیونکہ آج دنیا پہلے سے کہیں زیادہ امن وسلامتی کی محتاج ہے۔ امریکہ میں دہشت گردی کے ان المناک حوادث سے یہ سبق حاصل کیا جا سکتا ہے کہ بعض غیر فوجی وسائل وامکانات زیادہ مہلک و خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بعض گنے چنے لوگ اپنے خطرناک منصوبوں کے ذریعہ اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر علاقائی اور عالمی صلح وسلامتی کو مہلک خطروں کا شکار بنا سکتے ہیں۔ درحقیقت دہشت گردی ایک ایسی اعتقادی بیماری کا نام ہے جس کی بنیاد ان تمام مادی ومعنوی وسائل وامکانات کے ناجائز استعمال پر قائم ہے جس پر سبھی لوگ اعتماد وبھروسہ رکھتے ہوں۔ یہ مٹھی بھر لوگ غیر فوجی وسائل، انسانی اقدار اور مذہبی عقائد واعتقادات وغیرہ کا بھی ناجائز استعمال کرتے ہیں۔ ابھی امریکہ دہشت گردی پھیلانے والے مجرمین کی شناخت نہیں ہو سکی ہے اور ایسی صورت میں اسلام اور مسلمانوں کو مورد الزام قرار دینا یقیناً بہت بڑی ظالمانہ حرکت ہے یہاں تک کہ اگر یہ بات ثابت بھی ہو جائے کہ یہ دہشت گردانہ حرکت کرنے والے افراد بظاہر مذہب اسلام سے وابستہ ہیں تو بھی اسلام کو مورد الزام ٹھہرانے کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ کیا ان المناک اور انسانیت سوز حوادث کی تخلیق میں مسافر

بردار ہوائی جہاز کا ناجائز استعمال نہیں کیا گیا ہے؟ کیا کچھ مسافر بردار ہوائی جہازوں کے ناجائز استعمال کے بعد یہ نتیجہ اخذ کرنا منطقی ہوگا کہ وہ مسافر بردار جہاز، اس جہاز کے بنانے والے ماہرین اور اس پر سوار تمام مسافرین میں خرابی تھی جس کی وجہ سے یہ حوادث رونما ہوئے ہیں؟!

مذہب اسلام نے بنی نوع انسان کی عظمت و حرمت کا اعتراف جس انداز میں کیا ہے اس کی مثال دیگر ادیان و مذاہب اور مکاتب فکر میں کم ہی دکھائی دیتی ہے۔ قرآن ایک معتبر ترین سند کی حیثیت سے اس سلسلے میں ارشاد فرماتا ہے:

من قتل نفساً بغیر نفسٍ اوفسادٍ فی الارض فکانّما قتل النّاس جمیعاً ومن احیاھا فکانّما احیاالنّاس جمیعاً "(سورہ المائدہ آیت ۳۲)

یعنی انسان کی جان کسی قسم کے جنسی نسلی، مذہبی اور لسانی امتیاز و بھید بھاؤ کے بغیر ہر طرح کے تعرض سے پوری طرح محفوظ ہے۔ خداوند عالم نے ہر مخلوق کو عقل و حکمت کے ساتھ خلق کیا ہے اور ترقی و سربلندی کے تمام اختیارات سے اسے پوری طرح مالامال بنا رکھا ہے۔ کسی آدمی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی بے گناہ شخص کی زندگی میں تعرض و مداخلت کر سکے۔

دوسری آیۂ کریمہ میں قرآن مجید کا ارشاد ہے

" وَلاتقتُلوا النّفس الّتی حرّم اللہ الاّ بِالحق ومن قُتل مظلوماً فقد جَعلنالولیّہ سُلطاناً فلایُسرف فی القتل انّہ کانَمنصورًا(سورہ الاسراء آیت ۳۳)

اس آیۂ کریمہ میں بھی کسی قسم کے امتیاز یا بھید بھاؤ کے بغیر بنی نوع انسان کے جان کی حفاظت کی بات کہی گئی ہے۔ اس آیت کے مطابق اگر کوئی شخص کسی مظلوم کو

تعرض و دست درازی کا نشانہ بناتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی جان کی حفاظت کے دائرہ کو توڑ دیتا ہے اور مقتول کے سرپرست کو اسلامی قانون کے مطابق یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ چاہے اس سے قصاص وانتقام لے، چاہے معاف کردے اور چاہے تو اپنے مقتول کا خون بہا حاصل کرلے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ قرآن ''مظلوم مقتول'' کے سرپرست کو یہ حکم دیتا ہے کہ وہ مظلوم ہونے کی آڑ میں تشدد، قتل عام اور خونریزی نہ کرے کیونکہ خداوند عالم بہرحال اس کی حمایت وسرپرستی کرے گا۔ (چاہے وہ قانونی چارہ جوئی کی بات ہو یا رائے عامہ کا مسئلہ دونوں ہی صورت میں مظلوم ہی کی حمایت کی جاتی ہے)۔

دہشت گردانہ اعمال وافعال کے خلاف مبارزہ وجدوجہد کے لئے تمام قوموں اور حکومتوں کے درمیان بھرپور تعاون کی ضرورت ہوتی ہے۔ کسی ایک ملک کے مخصوص مفاد ومصالح کی خاطر کی جانے والی سیاسی نقل وحرکت سے عالمی امن وسلامتی کا مسئلہ قطعی حل نہ ہوگا۔ اب تک دہشت گردی کے خلاف کسی بین الاقوامی کنونشن یا عالمی معاہدہ کی ناموجودگی کا بنیادی سبب یہی رہا ہے کہ ہر ملک دوسرے ملک کو محکوم قرار دیتا رہا، ہر ایک اپنے دوست ملک کو آزادی طلب اور اپنے مخالف گروپ کو دہشت گرد قرار دیتا رہا۔ پس جب تک دنیا کے تمام ممالک کے درمیان مفاہمت نہیں پیدا ہوجاتی، دہشت گردی کے خلاف جدوجہد کا مسئلہ ہرگز حل نہ ہوگا۔ ضمناً یہ عرض کردینا لازمی ہے کہ بین الاقوامی اصول وقوانین مثلاً جنیوا کنونشن پروٹوکول نمبر ا کے مطابق سامراج اور تسلط طلب طاقت کے خلاف جدوجہد کو سرکاری اعتبار سے تسلیم کیا جاچکا ہے اور دنیا کی ہر قوم اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لئے پوری طرح آزاد ہے۔

☆☆☆☆

ظلم ونسل پرستی کی ممنوعیت

کا

قانون

از: محمد حسن مظفری

اسلام عدل وانصاف کا مذہب ہے اور ظلم کی ڈٹ کر مخالفت کرتا ہے چاہے وہ کسی رنگ روپ اور شکل وصورت میں پایا جاتا ہو۔ اسلام نے دوسروں کے حقوق کے سلسلے میں تجاوز وزیادتی اور دوسروں کی جان ومال اور عزت وآبرو کے سلسلے میں تعرض و دست درازی کو حرام قرار دیا ہے۔ قرآن مجید میں سورۂ بقرہ کی ۲۷۹ویں آیۂ کریمہ میں دو نہایت مختصر مگر خوبصورت کلمات میں اس قانون کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس آیت میں ربا کی تحریم کا اعلان ہے۔ ربا کا مطلب ایسے ضرورت مند لوگوں سے سود وصول کرنا ہے جو زندگی کے بوجھ اور دباؤ سے تنگ آکر قرض لینے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں۔ اسلام نے ربا کو ظلم کے نام سے یاد کیا ہے کیونکہ نیاز مند افراد سے سود لینے کی وجہ سے معاشرہ آہستہ آہستہ دولتمند وفقیر اور سود لینے والے ؟ دو طبقوں میں تبدیل ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے سماج میں اقتصادی نابراری اور طبقاتی دراڑ پیدا ہو جاتی ہے۔ اسلام رباگیری وسود خوری کو معاشرہ میں اقتصادی ظلم ونا انصافی کی اہم علامت جانتا ہے اور قرض دینے والوں سے یہ

مطالبہ کرتا ہے کہ تم کو صرف اپنے "اصل سرمایہ" کی واپسی کا حق حاصل ہے اور اس کے علاوہ کسی قسم کا سود حاصل کرنا حرام ہے۔اس آیہ مبارکہ میں ربا کی تحریم و ممنوعیت کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے۔" لاتَظلمون و لاتظلمون"[1] نہ کسی پر ظلم کرو اور نہ کسی کا ظلم قبول کرو۔اسلام نے لاتَظلمون و لاتُظلمون کو ایک بنیادی قانون کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور مسئلہ ربا ظلم و ناانصافی کی مختلف شکلوں میں سے ایک ہے۔

ظلم کے مختلف رنگ وروپ ہوتے ہیں ۔ یہ اکثر و بیشتر سماجی ، سیاسی، قومی ، مذہبی، نسلی، زبانی اور ثقافتی رنگ و روپ میں دکھائی دیتا ہے اور اس قرآنی قانون کی بنیاد پر ظلم، چاہے جس شکل و صورت میں بھی ہو، مذموم اور حرام ہے۔عادلانہ راہ وروش اختیار کرنا اور ظالمانہ راہ وروش کو حرام قرار دینا مذہب اسلام کے بنیادی "قانون ساز" اصولوں میں سے ایک اہم اصول ہے۔اکثر اسلامی احکام جو وضاحت کے ساتھ بیان نہیں ہوتے تھے، ایسے ہی بنیادی اصولوں کے ذریعہ استنباط کئے جاتے تھے۔اسلام نے ظلم کی تمام شکلوں کی شدید مذمت کی ہے اور عدل وانصاف کی چاہے وہ کسی رنگ و روپ میں ہو، بھرپور حمایت کی ہے۔ قرآن نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ وہ دشمن کی ظالمانہ و معاندانہ راہ وروش کو اپنے ظالمانہ اخلاق کے لئے بہانہ قرار دیتے ہوئے عدل وانصاف کے دائرہ سے باہر نہیں جاسکتے ہیں۔" وَلایَجرِمَنَّکُمْ شَنَأنُ قَوْمٍ عَلٰی اَلّاتَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَاَقْرَبُ لِلتَّقْوىٰ۔"[2]

اسلام کی عدل پسندی وانصاف دوستی اور ظلم کے خلاف باقاعدہ نبرد آزمائی کا قانون غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔یہی وہ قانون ہے جس نے اسلام کو ایک انسانی اور عالمی مذہب بنادیا ہے۔اسلام کی روح ظلم و ناانصافی کے ہر رنگ وروپ سے متنفر ہے اور امتیاز

وبھید بھاؤ ظلم وناانصافی کے بد نما چہروں میں سے ایک ہے۔ پیغمبر اکرمؐ ساری زندگی نسلی فضیلت پسندی اور رنگ وزبان کے امتیاز کے خلاف جدوجہد میں سرگرم رہے چنانچہ نسلی امتیاز وتفاخر کی تردید و مذمت میں ان کی بیشمار احادیث موجود ہیں۔اس کے علاوہ قرآن مجید میں ارشاد خداوندی ہوتا ہے" یاَاَیُّهَاالنَّاسُ اِنَّا خَلَقْنَاکُمْ مِنْ ذَکَرٍ وَّاُنْثٰی وَجَعَلْنَاکُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقَاکُمْ۔"[۳] یعنی مذہب اسلام میں رنگ ونسل وزبان وغیرہ نہیں بلکہ فضیلت وبرتری کی کسوٹی تقویٰ وپرہیزگاری ہے اور امسال اسی ستمبر کے مہینے میں جنوبی افریقہ میں واقع ڈربان شہر میں نسل پرستی کے خلاف منعقد کی گئی عالمی کانفرنس کا بنیادی مقصد درحقیقت انہیں ارمانات کو عملی جامہ پہنانا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس عالمی کانفرنس میں شریک مندوبین نے درج ذیل دوباتوں پر خصوصی توجہ دی ہے۔

الف۔ صہیونیت درحقیقت نسل پرستی کے برابر ہے

ب۔ افریقہ کے مظلوم عوام کو غلامی وبردگی کی زنجیروں میں جکڑنے والی دنیا کی سامراجی حکومتوں کو اس جرم کے لئے معذرت خواہی کرنی ہوگی اور اس ظالمانہ راہ وروش کے شکار ملکوں کو خسارہ کی تلافی کے لئے لازمی رقم بھی ادا کرنی پڑے گی۔

یہ عالمی کانفرنس بحث ومباحثہ کے ابتدائی مرحلہ میں اپنے بنیادی مقصد کی طرف گامزن تھی اور آخری مرحلہ میں جاری کی جانے والی قرارداد کے مسودہ میں یہ بات بھی تسلیم کرلی گئی تھی کہ "صہیونیت نسل پرستی کے برابر ہے۔" لیکن امریکہ اور صہیونی حکمراں اس بات پر راضی نہ ہوئے۔ چونکہ ان دونوں ممالک کے پاس اپنی ناراضگی کے دفاع کے لئے کوئی منطقی دلیل موجود نہ تھی اسی وجہ سے ابتدائی مرحلے میں ہی یہ دونوں

ممالک کانفرنس سے باہر آگئے اور یوروپی ودیگر ممالک پر اپنے دباؤ کے ذریعہ اس کوشش میں کامیاب ہوگئے کہ قرارداد سے پہلے حصے کو الگ کردیا جائے جس میں ساری دنیا نے متفقہ طور پر صہیونیت کی مذمت کی تھی۔ بہر حال اس عالمی کانفرنس کی آخری قرارداد میں فلسطینیوں کے لئے آزاد ملک کی تشکیل کی حمایت کی گئی ہے۔

حیرت انگیز بات ہے کہ انسانی حقوق کی حمایت میں فلک شگاف نعرہ بلند کرنے والے ممالک بشر دوستانہ دخل اندازیوں کے بہانے دنیا کے مختلف ملکوں میں مداخلت کررہے ہیں اور دوسری طرف صہیونی جلادوں کے نسل پرستانہ مظالم کی اس طرح حمایت وپشت پناہی بھی کررہے ہیں۔

درحقیقت غور طلب بات ہے کہ یہ نسل پرستی کیا ہے؟ اور کیا صہیونی حکومت ایک نسل پرست حکومت ہے؟ ان بنیادی موضوعات کا تجزیہ کرتے وقت تنظیم اقوام متحدہ سے وابستہ بین الاقوامی اسناد ومدارک اور عالمی قراردوں کی بعض اہم دفعات کی طرف اشارہ کرنا لازمی معلوم ہوتا ہے:

''اس دنیا میں پیدا ہونے والے تمام لوگ آزاد پیدا ہوئے ہیں اور سب لوگوں کو یکساں عزت اور مساوی حقوق حاصل ہیں۔ اس دنیا کے ہر فرد کو چاہے وہ کسی بھی رنگ، نسل، جنسیت، زبان، سیاسی نظریہ، یا کسی دوسرے عقیدہ و نظریہ کا حامل ہو یا سماجی واقتصادی اعتبار سے اسکا تعلق کسی بھی طبقے سے ہو سبھی لوگ مساوی حقوق کے حامل ہیں... قانون کی نگاہ میں سبھی لوگ برابر ہیں اور کسی فرق وامتیاز کے بغیر سب لوگوں کو قانون کی مساوی حمایت حاصل ہے۔''[۲]

'' بین الاقوامی تنظیموں اور اہم عالمی اداروں سے وابستہ ممالک نے مختلف

کنونشنوں کے دوران انسان کے سماجی، اقتصادی اور ثقافتی حقوق کے بارے میں یہ عہد کیا ہے کہ کنونشن کے دوران پاس شدہ حقوق کو نسل، رنگ، جنسیت، زبان، مذہبیت اور قومیت وغیرہ کی بنیاد پر فراہم نہ کیا جائے گا بلکہ یہ حقوق سب کے لئے مساوی طور پر فراہم ہوں گے اور اس سلسلے میں کسی قسم کا امتیاز یا بھید بھاؤ نہ ہوگا۔ اس کے علاوہ دنیا کے ہر آدمی کو کام کاج، مناسب مزدوری اور لازمی تربیت کے مساوی مواقع حاصل ہوں گے۔"

۵ "ممبر مالک نے اس بات کا بھی عہد کرر کھا ہے کہ کسی بھی امتیاز و فضیلت کے بغیر قانون کی نظر میں ہر آدمی مساوی حقوق کا حامل اور قانون کی حمایت وسرپرستی سے مالا مال ہے اور ہر ممکن امتیاز و فضیلت کے مقابلے میں قانون بچوں کے حقوق کی حمایت کرے گا۔" ۶

ممبر ممالک نسلی امتیاز و فضیلت کی بھرپور مذمت کرتے ہیں اور ایسی سیاست کو عملی جامہ پہنانے کی حمایت کرتے ہیں جو نسلی امتیاز اور اس کے ہر رنگ وروپ کو صفحہ ہستی سے نابود کردے۔ ممبر ممالک اس بات کا بھی عہد کرتے ہیں کہ وہ نسلی امتیاز کو مٹانے کی بھرپور کوشش کریں گے چاہے اس کو کسی ایک شخص، کسی جماعت یا کسی بڑی تنظیم کے ذریعہ عملی جامہ پہنایا جارہا ہو۔ ممبر ممالک نسلی امتیاز کو ممنوع قرار دینے اور اس کو پوری طرح محو کردینے کا اٹل فیصلہ اور مستحکم عہد کرتے ہیں اور رنگ و نسل و قومیت کی بنیاد پر کسی امتیاز و فضیلت کو نگاہ میں رکھے بغیر ہر آدمی کو برابر کا حق دیں گے۔ قانون کی نگاہ میں دنیا کا ہر فرد مساوی حقوق کا حامل ہوگا۔ دنیا کا ہر آدمی کو مساوی سیاسی، اقتصادی، سماجی اور ثقافتی حقوق حاصل ہوں گے اور خصوصیت کے ساتھ مزدوروں کو عادلانہ حالات اور مناسب کام اور مساوی کام کے عوض میں مساوی مزدوری فراہم کی جائے گی۔ بے روزگاروں کی حمایت کی جائے گی۔ اور ہر ایک کے لئے مکان اور صحت وسلامتی کی دیکھ

بھال کے لئے مناسب طبی انتظام ہو گا۔ ہر فرد کے لئے سماجی سلامتی و سماجی خدمات نیز تمام لوگوں کی تعلیم و تربیت کی فراہمی کی ضمانت ہو گی۔ اس کے علاوہ نسلی امتیاز کے خلاف کی جانے والی جدو جہد کے دوران جو لوگ اس راہ میں اپنی جان نچھاور کر دیں گے ان کے پسماندگان کی حمایت کی جائے گی۔"۷

ممبر ممالک بچے باپ یا اس کے سر پرست کی نسل، زبان جنسیت اور اس کے رنگ و مذہب کے سلسلے میں کسی قسم کے امتیاز کے بغیر بچے کے احترام کے ساتھ ہی ساتھ اس کے وارث کے حقوق کی حفاظت کریں گے۔

"تمام ممبر ممالک نے بچے کی تعلیم و تربیت کے حق کو تسلیم کیا ہے۔ ان لوگوں کو چاہیے کہ عمومی اعتبار سے بچوں کی تعلیم کو لازمی قرار دیتے ہوئے انہیں تعلیمی وسائل و امکانات فراہم کریں۔ جس ملک میں مذہبی قومی اور زبانی اقلیت والی قومیں آباد ہیں وہاں اقلیتی جماعت کے کسی بچے کو قومی ثقافت تہذیب و تمدن مذہب یا اس کی اپنی زبان سے محروم نہ ہونے دیا جائے۔"۸

انسانی حقوق کے سلسلے میں بعض بین الاقوامی کنونشن کی اسناد کا تذکرہ کرنے کے بعد قاری کے ذہن میں درج ذیل سوال ابھر سکتے ہیں۔

کیا صہیونی حکومت کے سایہ میں فلسطینی عربوں اور اسرائیلی صہیونیوں کو برابر کے حقوق حاصل ہیں؟

کیا شغل اور حکومتی عہدہ و مقام کے اعتبار سے عربوں اور صہیونیوں کو مساوی مواقع فراہم ہیں؟

صہیونی نقطہ نظر سے فلسطینی عوام کا اس کے علاوہ اور کیا جرم ہے کہ وہ عربی زبان

بولتے ہیں، مذہبی اعتبار سے یہودی نہیں ہیں اور غیر صہیونی سیاسی عقائد کے حامل ہیں؟

کیا ایک فلسطینی بچے کو اور افریقہ، امریکہ اور یورپ سے لائے گئے ایک یہودی بچے کو برابر کے حقوق حاصل ہیں جو صہیونی حکمرانوں کے ذریعہ مقبوضہ علاقوں میں آباد کیا گیا ہے؟

کیا صہیونی حکومت دنیا کے مختلف ملکوں سے لائے گئے یہودیوں کو مقبوضہ علاقوں میں سکونت نہیں فراہم کر رہی ہے۔؟

کیا فلسطینی عوام کے گھروں کو صہیونی حکمرانوں کے ذریعہ تباہ و برباد نہیں کیا جارہا ہے؟ کیا صہیونی حکومت اس علاقے کے باشندوں کو فلسطینیوں کے خلاف جنگی کارروائی کے لئے انہیں مسلح نہیں کر رہے ہیں؟

کیا صہیونی حکومت ان فلسطینی باشندوں کو بھی بین الاقوامی قوانین کے مطابق خسارہ ادا کر رہی ہے جن کے گھروں کو دنگے فساد کے دوران ویران کر دیا گیا یا جن کے وارثوں کو ہلاک کر دیا گیا ہے؟

دنیا کے سبھی اخباروں میں ہر روز نسل پرست صہیونی مظالم کی جھلک دکھائی دیتی ہے اور دنیا والے صہیونی جلادوں کے امتیازانہ سلوک کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ پس ایسی صورتحال میں نسل پرستی کے خلاف کی جانے والی کانفرنس کے مرکزی ہال سے باہر آجانے سے یا اس کانفرنس کی آخری قرارداد سے نسل پرستی کی مذمت والی عبارت کے حذف کر دینے سے صہیونی حکمرانوں اور ان کے طرفداروں کا مسئلہ حل ہونے والا نہیں ہے۔

بالکل اسی طرح جیسے آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ برسوں پہلے افریقی عوام کو امریکہ

یورپ اور ایشیا کے بازاروں میں بیچا گیا تھا لیکن آج بھی انسانی ضمیر چند دہائی قبل ہونے والے مظالم سے گھائل دکھائی دے رہا ہے اور ساری دنیا ان ملکوں کی حمایت وطرفداری کا اعلان کر رہی ہے جہاں کے لوگ کل غلامی و بردگی کا شکار ہوئے تھے۔ پس وہ دن دور نہیں رہ گئے جب صہیونی حکومت کو بھی دنیا کے ان بیدار ضمیر لوگوں کا سامنا کرنا ہوگا۔ "الیس الصبح بقریب۔"؟ ۹ کیا صبح نزدیک نہیں ہے؟

حوالے:

۱۔ سورہ بقرہ، آیت ۲۷۹

۲۔ سورہ مائدہ آیت ۸

۳۔ سورہ حجرات آیت ۱۲

۴۔ عالمی انسانی حقوق میمورینڈم دفعات ۱، ۲، ۷، اور ۲۳

۵۔ عالمی انسانی سماجی اقتصادی اور ثقافتی حقوق کنونشن دفعات ۲، ۱۴، ۲۴، ۲۶

۷۔ نسلی امتیازات کی تمام شکلوں کی نابودی کا کنونشن دفعات ۲، ۵ اور ۶

۸۔ بچوں کے حقوق کا کنونشن دفعات ۲، ۲۸، ۳۰

۹۔ سورہ ھود آیت ۸۱

☆☆☆☆

اسلامی حکومت کے مقاصد

از: مصطفیٰ اربابی

اس مقالہ میں اسلامی حکومت کے مقاصد کو تین حصوں میں بڑے اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے:

ا۔ روئے زمین پر خدا کے دین اور شریعت کی حاکمیت: تاکہ دنیا کے تمام انسان قدرتی نظام کے ثمرات اور فوائد سے بہرہ ور ہوں اور انسان نظام قدرت وخلقت کے تمام شعبوں سے ہماہنگ اپنے بنیادی مقصد کی طرف جس کی وجہ سے ان کی تخلیق عمل میں آئی ہے، پیش قدم ہو سکے اور آخر مرحلہ میں وہ عنایات الٰہی کے فیض سے بہرہ ور ہو سکے۔''فادخلی فی عبادی وادخلی جنّتی "(سورہ الفجر۔ آیت۲۹)

۲۔ جاہلیت کی نفی وتردید تاکہ اس وسیلہ سے انسانی عقائد، اخلاق اور سلوک میں رشد واصلاح کی زمین ہموار ہو سکے اور انسان شر اور فساد کے عوامل کی تردید کی توفیق حاصل کرلے کیونکہ جاہلیت اور جاہلانہ معیار کی نفی کے بغیر انسان کے لئے رشد وکمال کے تمام راستے بند ہوتے ہیں۔

۳۔ دنیا میں عدل وانصاف کی اشاعت:- تاکہ اس کے سایہ میں امانتوں کو ان کے مستحقین تک پہونچایا جاسکے۔ انسان کی زندگی عدل وانصاف کے پیرائے میں کامیاب ہو اور معاشرہ میں عدل وانصاف کا بول بالا ہو سکے۔ اور تمام اشیاء اپنے مناسب مقامات پر قائم رہیں یہاں تک کہ انسانی نظام حیات کا کوئی شعبہ کسی دوسرے شعبہ پر ظلم وتجاوز نہ کرسکے۔ اور بالآخر انسانی زندگی میں توازن وتعاون برقرار رہے۔ اور انسان ترقی کے راستہ پر گامزن رہے۔ امید ہے کہ ہماری یہ پیشکش قارئین کو پسند آئے گی۔ (ادارہ)

اسلامی حکومت کے مقاصد

الف: روئے زمین پر خدا کے دین اور شریعت کی حاکمیت:

اسلامی حکومت کا بنیادی مقصد خدا کے دین اور شریعت کو روئے زمین پر استقرار واستحکام عطا کرنا ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ان الحکم الا للّٰہ امر ان لا تعبدوا الاّ ایاہ ذالك الدین القیّم ولکنّ اکثر النّاس لا یعلمون ۔"(آیت ۴۰ سورہ یوسف)

فرمانروائی صرف اللہ تعالیٰ کی ہے۔ اس کا فرمان ہے کہ تم سب سوائے اس کے کسی اور کی عبادت نہ کرو۔

یہی دین درست ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

" وان احکم بما انزل اللہ ولا تتبع اھوائھم واحذرھم ان یفتنوك عن بعض ماانزل اللہ الیك ۔"(آیت ۴۹ سورہ المائدہ)

اور آپ کو اے پیغمبرؐ ہم حکم دیتے ہیں کہ آپ ان کے معاملات میں خدا کی نازل کردہ وحی کے مطابق ہی حکم کیا کیجئے۔ ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کیجئے اور ان سے ہوشیار رہئے کہ کہیں آپ کو اللہ کے اُتارے ہوئے کسی حکم سے ادھر ادھر نہ کریں۔

قرآن کریم کے اس صریح وضاحت کی روشنی میں اسلامی حکومت کا یہ فرض ہوتا ہے کہ خدا کے دین اور شریعت کی حاکمیت کو اپنا اہم مقصد قرار دے۔

خدا کے دین اور اس کی شریعت کی حاکمیت مختلف ثمرات اور امتیازات کی حامل ہے

جس کو اجمالی طور پر ذیل میں بیان کیا جا رہا ہے۔

ا۔ خداوند قدوس خالق کائنات ہے۔ وہ ہماری اچھائی کو ہم سے بہتر جانتا ہے کیونکہ اسی نے اس دنیا کو وجود و ظہور سے آراستہ کیا۔ اور وہ دنیا کے جملہ اسرار سے واقف ہے۔ اور سب چیزوں کو بخوبی جانتا ہے۔

(الا يعلم من خلق وهو اللطيف الخبير)(آیت ۱۴ سورہ الملک)

یعنی بھلا جس نے پیدا کیا وہ بے خبر ہے اور وہ تو بڑا باریک بین واقف کار ہے۔

جب کہ یہ تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ انسان کے ذریعہ بنائے گئے قوانین و ضوابط میں نقص ہوتا ہے

۲۔ خدا کے دین کی حاکمیت کے سایہ میں حاکم اور فرمان بردار نیز بادشاہ اور رعایا دونوں کیلئے قانون کی اطاعت لازمی قرار دی گئی ہے۔

دونوں کا فریضہ ہے کہ وہ قانون الٰہی کی پیروی کریں اور خود کو کسی قسم کی رعایت کا حق دار محسوس نہ کریں اس طرح سے خدا کے دین کی حاکمیت کے سایہ میں بلندی اور برتری کا پودا خشک نہیں ہوتا اور سبھی لوگ قانون کی نظر میں مساوی ہیں۔

(تلك الدّار الآخرة نجعلها للّذين لايريدون علوّا في الارض ولا فساداً والعاقبة للمتّقين۔)سورہ القصص آیت ۸۳۔

یعنی آخرت کا یہ بھلا گھر ہم ان ہی کے لئے مقرر کردیتے ہیں جو زمین میں اونچائی، بڑائی اور فخر نہیں کرتے۔ نہ فساد کی چاہت رکھتے ہیں۔ پرہیزگاروں کے لئے نہایت ہی عمدہ انجام ہے۔

۳۔جب حکومت کا مقصد خدا کی خوشنودی خدا کو قادر مطلق جاننا ہو۔

اسلامی حکمران غیر شرعی طریقے سے قوت حاصل کرنے کیلئے ہرگز آمادہ کوشش نہیں ہوتا اور نہ ہی عوام کو دھوکہ دیتا ہے نہ لوٹ کھسوٹ کرتا اور نہ قتل و غارت گری کی طرف مائل ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو اسے بدنامی اور رسوائی جھیلنی پڑتی ہے۔ اور عوام باخبر ہو جاتے ہیں کہ وہ اسلامی حکومت کے مقاصد کی رعایت نہیں کرتا ہے۔

۴۔خدا اور اس کے رسول کی تعلیمات کی روشنی میں معاشرہ سماجی عدل وانصاف سے بہرور ہوتا ہے۔

(لقد ارسلنا رسلنا بالبیّنات وانزلنا معهم الكتاب والميزان ليقوم النّاس بالقسط (آیت ۲۵ سورہ الحدید)

یقیناً ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلی دلیلیں دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان (سماجی عدل وانصاف کے اصول) بھی نازل فرمائے تاکہ یہ لوگ لوگوں کے ساتھ عدل وانصاف پر مبنی سلوک وبرتاؤ کریں۔

(ولا يجرمنّكم شنانُ قوم على ان لاتعدلوا اعدلوا هو اقرب للتقویٰ) آیت ۸ سورہ المائدہ۔

کسی قوم کی عداوت کہیں تمہیں عدل انصاف کی خلاف ورزی پر آمادہ نہ کردے پس عدل کیا کرو جو پرہیزگاری کے زیادہ قریب ہے۔

اس طرح ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ بعثت انبیاء اور آسمانی کتابوں کو نازل کرنے کی ایک وجہ معاشرہ میں عدل وانصاف کا قیام رہا ہے۔

پس روئے زمین پر خدا کے دین اور شریعت کی حاکمیت کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی سماجی زندگی کے مختلف شعبوں میں عدل انصاف سے بہرہ ہوتے رہیں۔

۵۔روئے زمین پر خدا کے دین اور شریعت کی حاکمیت کے سایہ میں ظلم کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

آسمانی کتابوں اور پیغمبروں کی رہنمائیوں کی بنیاد پر ظلم کے خلاف نبرد آزمائی کرنا اہل ایمان کا وطیرہ رہا ہے اور عالمی تاریخ میں اس کی معرکۃ الآرا یادگاریں موجود ہیں جن کو کوئی بھی انصاف پسند انسان ہرگز نظر انداز نہیں کر سکتا ہے۔

تمام انبیاء آدمؑ، نوحؑ اور خلیلؑ سے لیکر حضرت محمدؐ تک سبھوں نے ظلم کے خلاف جنگ کو اپنا اہم لائحہ عمل بنایا اور ان کے مصلح اور لائق پیروں کاروں نے بھی جور و ظلم کی بساط کو اکھاڑ پھینکنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑا یہاں تک کہ ایمان والوں میں سے بہت سے آزاد منش لوگوں نے اپنی جان کی قربانیاں دیں۔اس میں شک نہیں کہ یہ جہاد، فداکاری اور قربانی روئے زمین پر خداوند عالم کے دین و شریعت کی حاکمیت کے سلسلے میں کلیدی اور بنیادی کردار کی حامل ہے۔

۶۔ خدا کے دین کی حاکمیت جاہلانہ تعصّبات کو ختم کرتی ہے۔

(یاایها النّاس انّا خلقناکم من ذکر و انثیٰ وجعلنا کم شعوبا وقبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللّٰه اتقاکم)سورہ حجرات آیت ۱۳)

ترجمہ :اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک ماں اور باپ سے پیدا کیا۔اور تم کو ملتوں اور قبیلوں میں تقسیم کیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔

حق یہ ہے کہ خدا کے نزدیک وہی محترم ہے جو تم میں سب زیادہ پرہیز گار ہے۔

اس طرح خدا کا دین ہر طرح کے قومی، ملی اور نسلی تفریق کو باطل قرار دیتا ہے۔

البتہ یہ سب جانتے ہیں کہ جاہلانہ اور اندھے تعصّبات کو ختم کرنا خدا کے دین کے داعیوں کا اہم ترین کام رہا ہے اور ہم بخوبی جانتے ہیں کہ انبیاء علیہ السلام نے اس طرح کے تعصّبات کو ختم کرنے میں بہت کوششیں کیں اور زحمتیں اٹھائیں۔ اور ہر موقع پر تمام بشر کو اس جاہلانہ تعصّبات سے احتراز کرنے کی دعوت دی۔ اور لوگوں کو خبر دار کیا کہ اس طرح کے عقیدہ پر اعتقاد رکھنا خدا کے دین اور شریعت کی خلاف ورزی کرنا ہے۔

۷۔ روئے زمین پر خدا کے دین اور شریعت کی حاکمیت معاشرہ میں اخلاقی فضائل و کمالات کی نشو نما کا موجب ہوتا ہے۔

(وانّك لعلىٰ خلق عظيم) سورہ القلم۔ آیت ۴

اور بیشک اے نبی آپ عظیم اخلاق کے حامل ہیں۔

پیغمبرؐ نے فرمایا۔

(بعثت لاتمم مكارم الاخلاق)

میں عہدۂ رسالت پر فائز کیا گیا ہوں تا کہ اخلاقی قدروں کو منزل تک پہنچاؤں۔

اس طرح خدا کا دین اور شریعت اخلاقی کمالات وفضائل کو اہل ایمان اور داعیوں کے لئے اہم قرار دیتا ہے۔ اور ہر وہ معاشرہ جو اس نعمت سے بہرور ہوتا ہے دنیا کے لئے ایک عمدہ مثال ہوتا ہے۔

۸۔ حریت اور آزادی خدا کے دین اور شریعت کی حاکمیت کے ساتھ

عملی رنگ وروپ اختیار کر لیتی ہے۔

زمانہ قدیم ہی سے انسان حصول آزادی کا متلاشی رہا ہے اور اس لئے لگاتار کوشش کرتا رہا ہے۔ لیکن حقیقی آزادی اسی وقت میسر ہو سکتی ہے جب تمام انسان اللہ کی بندگی کے دائرہ میں آجائیں اور غیر اللہ کی بندگی کو ترک کردیں خدا کے دین اور شریعت کی حاکمیت کے بغیر، اس راستے کی ہر کوشش یاس اور ناامیدی پر ختم ہوتی ہے۔ اگر کوئی آزادی کے تحفہ کا طلبگار ہے تو وہ خود خدا کی اطاعت قبول کرلے اور لوگوں کو اس کی بندگی کے دائرہ میں لے آئے۔

بقول حافظ:

من همانندم که وضو ساختم از چشمهٔ عشق
چهار تکبیر زدم یکسره بر هر چه که هست

جی ہاں! یہی وہ عقیدہ ہے جس کی بنیاد پر انسان غیر خدا کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہر گز قبول نہیں کرتا ہے۔ بلکہ جب کبھی غیر خدا کی عبادت کی بات کہی جاتی ہے تو اسے ٹھکرا دیتا ہے اور اس طرح اسے حقیقی آزادی نصیب ہو جاتی ہے۔

۹۔ دین اور شریعت خداوندی کامل وشامل ہے۔

دین اور شریعت خداوندی تمام ابعاد زندگی پر غالب ہے۔ خدا کا دین محض بعض انسانی ضرورتوں کی طرف توجہ نہیں کرتا ہے بلکہ انسانیت کے تمام شعبے اس میں شامل ہوتے ہیں حتی کہ فکر و اندیشہ، خلوت وجلوت ظاہر اور باطن، قیام وقعود، خواب وبیداری، غذا ولباس ومسکن، معاملات ومتفرقات، خوشی وغم، رضا وخشم، فقر وغنی، خاندان اور اولاد وبیوی، دوستی ودشمنی، صلح وجنگ، فرمانروا اور فرمانبردار غرضیکہ دنیا کی

تمام چیزوں پر اس کا غلبہ رہا کرتا ہے اور دنیا کی کوئی بھی چیز اس کے دائرہ اختیار سے باہر نہیں ہے۔ زندگی کا ایسا کوئی شعبہ نہیں ہے جس کے لئے اس کے پاس مدوّن اور آمادہ قانون موجود نہ ہو۔

ہر شعبہ کا اپنا ایک مدون اصول و قانون ہوتا ہے۔ خداوند عالم کا یہ پسندیدہ دین زندگی کے مختلف شعبوں کے لئے ایک نمایاں اور منظّم ضابطہ کا حامل ہے پس دنیا اور آخرت، ظاہر و باطن، دین اور حکومت سب شعبے اس زمرہ میں آتے ہیں اور انسان کو دلیل و حجت سے ناموزوں اور غیر معتدل طریقہ سے، جو زندگی کے کچھ شعبوں کو اپنی طرف راغب کرتا ہے، بے نیاز کر دیتا ہے۔ در حقیقت خدا کا دین اور شریعت الٰہی شخصی، خاندانی، سماجی، سیاسی اور فکری پریشانیوں کے علاج کا نسخہ ہے اور یہ ایک ایسی مجرب دوا ہے جو زندگی کے کسی حصے کو پریشانی اور مشکلوں سے دوچار نہیں ہونے دیتی ہے۔

اس مقصد میں کامیابی کی راہ

خدا کے دین اور الٰہی شریعت کی حاکمیت کو، جو اسلامی حکومت کا اہم ترین مقصد ہے۔ روئے زمین پر نافذ کرنے کا ایک واحد طریقہ یہ ہے کہ امت کی تربیت کی جائے۔ تاکہ امت وفادار مخلص ہو اور خدا کی حاکمیت کو خود اپنے اوپر اور اپنے خاندان اور معاشرہ کے درمیان نافذ کرنے کے لئے راستہ ہموار کرلے کیونکہ حکومت جبراً اسے لوگوں پر نافذ نہیں کرا سکتی۔

(افانت تکرہ الناس حتیٰ یکونوا مؤمنین سورہ یونس۔ آیت۹۹)

یعنی کیا تم لوگوں کو مجبور کرتے ہو تاکہ وہ مومن ہوں۔

ظاہر سی بات ہے کہ جو نسل اس مقصد کی علمبردار ہے اسے مندرجہ ذیل

خوبیوں اور خاصیتوں کا حامل ہونا چاہئے۔

قرآن کریم سے مضبوط اور اٹوٹ رشتہ۔

قرآن ایک کتاب ہدایت ہے اور روئے زمین پر خدا کے دین اور اس کی شریعت کی حاکمیت کے نفاذ کے سلسلے میں یہ یقیناً کتاب ہدایت کا درجہ رکھتی ہے۔

(ذالكَ الكتاب لاريب فيه هُدىً لِلّمتقين) سورہ بقرہ آیت ۲

ترجمہ: اس کتاب میں کوئی شک نہیں (یہ) پرہیزگاروں کو راہ دکھانے والی ہے۔

(ان هذ القرآن يهدى للتى هى اقوم۔ سورہ الاسراء۔ آیت ۹)

ترجمہ: بیشک قرآن ایسے راستہ کی طرف ہدایت کرتا ہے جو صحیح تر اور درست تر ہے۔

پیغمبر اسلام نے قرآن کے وسیلہ سے عرب کے صحرا نشین اور تہذیب و تمدن سے ناآشنا لوگوں کی اس طرح تربیت کی کہ وہ بشریت کے قدیم ترین انسانی تمدن کے مسائل کو حل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ اور مشہور و متمدن اور صاحب فکر و مہذب قوموں نے ان سے درس زندگی حاصل کرنا شروع کر دیا۔

یہ کتاب ہدایت خدا کے دین اور شریعت کی حاکمیت کو روئے زمین پر نافذ کرنے کے لئے رہنمائی کرتی ہے۔ اور اسلامی حکومت کا یہ فریضہ ہے کہ اس آسمانی کتاب اور امت کے مابین تعلق اور انس پیدا کرے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسلامی حکومت کے مقصد سے غافل ہے۔

۲۔ ذمہ داری کا احساس اور لاپرواہی سے پرہیز:

خدا کے دین اور اس کی شریعت کا قانون اسی صورت میں روئے زمین پر نافذ ہو سکتا ہے کہ امت خدا کے حکم کی طرف سے بے اعتنائی و لاپرواہی نہ برتے۔ بلکہ اسے اپنی

ذمہ داری اور فرض کا احساس ہو۔

ایک مدت تک مسلمانوں کا اس بات پر قوی عقیدہ وایمان تھا کہ اگر دنیا کے کسی گوشے میں کوئی مسلمان ظلم کا شکار ہے تو وہ فوراً بے چین ہو جایا کرتے تھے اور اگر انہیں یہ پتہ چل جاتا تھا کہ فلاں جگہ کے لوگ خدا کے دین اور شریعت سے بے خبر ہیں تو انہیں سکون نہیں ملتا تھا جب تک کہ اس مرد مسلمان کو ظلم سے نجات نہ حاصل ہو جائے اور دین اور شریعت سے غافل لوگوں کے اندر ایمان کی شمع نہ روشن ہو جائے۔

(ومالکم لا تقاتلون فی سبیل اللّٰہ والمستضعفین من الرّجال والنساء والولدان یقولون ربنا اخرجنا من ھذہ القریة الظالم اھلھا واجعل لنا من لدنك ولیا وّاجعل لنامن لدنك نصیرا) (سورہ نساء آیت۷۵)

ترجمہ: بھلا کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں ان ناتواں مردوں عورتوں اور ننھے ننھے بچوں کی نجات و چھٹکارے کے لئے جہاد نہ کرو؟ جو یوں دعائیں مانگ رہے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ان ظالموں کی بستی سے ہمیں نجات دے اور ہمارے لئے خود اپنے پاس سے حمایتی مقرر کر دے اور ہمارے لئے خاص اپنے پاس سے مددگار بنا۔

جب تک مسلمان اس صدائے آسمانی کی طرف دھیان دیتے رہے تب تک اس ذمہ داری کو فراموش نہیں کیا اور نہ ہی اپنے اوپر بے اعتنائی کو غالب ہونے دیا۔ لیکن جب انہوں نے اس ذمہ داری سے غفلت برتی تو معاشرہ میں خدا کے دین اور شریعت کی حاکمیت کی رونق کم ہوتی چلی گئی اور لوگ عزت اور سربلندی کے اس چشمہ سے دور ہوتے گئے۔ اس لئے کوئی بھی نسل خدا کے دین اور شریعت کی حاکمیت روئے زمین پر اسی وقت نافذ کر سکتی ہے جب کہ وہ بذات خود متعہد اور متکلف اور ذمہ دار ہو۔

۳۔ایثار و قربانی۔

روئے زمین پر خدا کے دین اور شریعت کی حاکیت کو نافذ کرنے والے رہنماؤں کی تیسری خاصیت ایثار و قربانی ہے۔ تاریخ اسلام ایمان والوں اور داعیوں کے ایثار اور ان کی قربانی کے اعلیٰ نمونہ سے بھری ہوئی ہے۔ وہ ایسے انسان تھے جنہوں نے اپنی تمام زندگی اخلاص کے ساتھ گذارتے ہوئے اپنی جان کی قربانی دے دی اور تاریخ میں انکی قربانی ایک مثال بن گئی۔

صحابہ کرام کے ایثار و قربانی کی حکایتیں اس حقیقت کی نشاندہی کرتی ہیں کہ بغیر ایثار و قربانی کے روئے زمین پر خدا کے دین اور شریعت کی حاکیت بر قرار نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ خدا یہ پسند کرتا ہے اپنے بندوں کی ایک جماعت کو آسانی کے ساتھ عزت اور افتخار سے سر فراز کرے۔

(ولیعلم الله الذین آمنوا ویتخذ منکم شهداء) سورہ آل عمران۔ آیت ۱۴

ترجمہ: تاکہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو ظاہر کردے اور تم میں سے بعض کو شہادت کا درجہ عطا فرمائے۔

(ام حسبتم ان تدخلوا الجنّة ولمّا یاتکم مثل الّذین خلوا من قبلکم) سورہ بقرہ۔ آیت ۲۱۴

ترجمہ: کیا تم یہ گمان کئے بیٹھے ہو کہ جنت میں چلے جاؤ گے۔ حالانکہ تم پر وہ حالات نہیں آئے جو تم سے اگلوں پر آئے تھے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ قوم کی ایثار و قربانی کے بغیر روئے زمین پر خدا کے دین اور شریعت کی حاکیت بر قرار نہیں ہو سکتی ہے کیونکہ ایثار و قربانی اللہ تعالی کی سنت ہے۔

۴۔ راہ حق پر چلنے والوں کی سیرت سے واقفیت

جس قوم کو اپنے رہنماؤں کی سیرت کا علم نہیں ہوتا بلکہ اور قوم واس کے رہنماؤں کے درمیان فاصلہ ہوا کرتا ہے وہ بہت جلد غیروں کی شان وشوکت اور رعب ودبدبہ کے سامنے ہتھیار ڈال دیتی ہے۔

بزرگان دین کی سیرت سے مکمل واقفیت و آگاہی معاشرہ کی تکمیل وترقی کی راہ ہموار کرتی ہے اور یہی ارتقاء خدا کے دین کی حاکمیت کو روئے زمین پر نشو نما عطا کرتی ہے کیونکہ انسان گذرے ہوئے واقعات سے پند و عبرت حاصل کرتا ہے اور گذرے ہوئے لوگوں کے تجربات سے موقع و محل پر استفادہ کرتا ہے۔ صالح بزرگوں کی راہ وروش فائدہ حاصل کئے بغیر اس عظیم مقصد یعنی روئے زمین پر دین وشریعت کی حاکمیت کے سلسلے میں کامیابی حاصل کرنا ممکن نہیں ہے۔

۵۔ عصری علم ودانش سے استفادہ

خداوند عالم نے ارادہ کیا ہے کہ خدا داد فطرت سے مطابقت رکھنے والی صحیح علمی راہ وروش سے فائدہ حاصل کئے بغیر معاشرہ پر الٰہی دین وشریعت کی حاکمیت کا قیام عمل میں نہ آئے بلکہ مرد مومن کو چاہئے کہ خداوند عالم نے اسے جو علم عطا کیا ہے اس کا بھرپور استعمال کرتے ہوئے اس کی زمین ہموار کرے اور علم ودانش کے سایہ میں معاشرہ میں دین وشریعت خداوندی کی حاکمیت قائم ہو۔

(وعلم آدم الاسمآء کلها) سورہ بقرہ۔ آیت ۳۱)

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ نے آدم کو تمام نام سکھائے۔

(الرحمٰن علّم القرآن ، خلق الانسان ، علّمه البیان) سورہ رحمٰن۔ آیت ۱ تا ۴)

یعنی رحمٰن نے قرآن سکھایا اسی نے انسان کو پیدا کیا اور اسے بولنا سکھایا۔

اب یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں رہ گئی کہ اسلامی حکومت کے اغراض ومقاصد میں مکمل کامیابی حاصل کرنے کے لئے علمی راہ وروش کا استعمال لازمی ہے اور اگر عالمی فطرت سے میل کھانے والی علمی راہ وروش سے کام نہ لیا گیا تو اس راہ میں کامیابی ہرگز ممکن نہیں ہے۔ پس علم حاصل کرنا اسلامی معاشرہ کی ایک اہم ضرورت ہے جس کے ذریعہ دین وشریعت خداوندی کی حاکمیت کو عملی جامہ پہنایا جاسکتا ہے۔

۶۔ مقصد کی شناخت:

اسلامی حکومت اور دین شریعت کے پرچم کے سایہ میں مقصد زندگی کی شناخت اسلامی حکومت کے مقاصد کی تکمیل میں غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے یعنی مقصد زندگی کی مکمل شناخت کے بغیر اسلامی حکومت کے مقاصد تک رسائی حاصل کرنا ناممکن ہے۔ جو لوگ اپنی زندگی کے مقصد سے ناواقف ہوتے ہیں وہ گمراہی کے ٹیلے پر اپنا راستہ بھول جاتے ہیں۔ اور اس طرح وہ دین وشریعت خداوندی کی حاکمیت سے پوری طرح محروم رہ جاتے ہیں۔

صرف وہی لوگ اس نعمت کے لائق ومستحق ہیں جن کے پاس ایک روشن مقصد اور اپنے مقصد کی صحیح پہچان ہوتی ہے۔ (ربعی بن عامرہ، اسلامی فوج کا نمایندہ ایرانی جرنل رستم کے جواب میں کہتا ہے۔)

رستم: تمہیں کونسی چیز یہاں کھینچ لائی ہے۔

ربعی: ہمارے پروردگار نے ہمیں یہ ذمہ داری سونپی ہے کہ ہم تم لوگوں کو بندگان خدا کی بندگی کی ذلت سے نجات دلاتے ہوئے خدائے وحدہ لاشریک وبے نیاز کی عبادت

وبندگی کی طرف راغب کریں اور تم لوگوں کو دنیا کی تنگی وبے سروسامانی سے نجات دلاتے ہوئے دنیاو آخرت کی وسعت کی طرف متوجہ کریں اور ادیان ومذاہب کے ظلم وستم سے نجات فراہم کرتے ہوئے اسلامی عدل وانصاف سے سرفراز کرسکیں۔[1]

اس میں کوئی شک نہیں کہ جس دن مسلمان اپنے مقاصد سے بخوبی واقف وآشنا ہوتے ہی فوری طور پر دین خدا کی علمبرداری کے لائق ہوجاتے ہیں اور دنیا میں دینی مقاصد کو عملی جامہ پہنانے میں سرگرم ہوجاتے ہیں اور یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ مقصد سے ناواقفیت کی وجہ سے غیروں سے وابستگی کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ باقی نہیں رہ پاتا اور نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ ملت کا کوئی بھی فرد بیگانہ طاقتوں کے مکروفریب سے محفوظ نہیں رہ جاتا ہے کیونکہ لوگ یہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ حکومت کا مقصد صرف یہ ہے کہ ان کے لئے ہر مادی ممکن ترقی وخوشحالی فراہم کردی جائے۔ حالانکہ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلامی حکومت کی ایک اہم ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ اپنے عوام کی مادی ترقی وخوشحالی کی زمین ہموار کرے لیکن اس کام کو اسلامی حکومت کا مقصد خیال کرنا مناسب نہیں ہے۔

ب۔ جاہلیت سے انکار۔

اسلامی حکومت کا ایک مقصد جاہلانہ بنیادی اصولوں اور معیاروں کی مکمل نفی وتردید ہے کیونکہ جاہلانہ افکار دینی عقائد اور اقدار کے تحقق میں رکاوٹ ہوتے ہیں۔
جاہلیت کی نابودی اور اس سے دوری وعلحدگی حاصل کرنے کے لئے ہمیشہ مندرجہ ذیل امور کی طرف توجہ دینی چاہئے۔

ا۔ عقیدہ کی اصلاح:

انبیاء و علیہم السلام کا اولین مقصد عقائد کی اصلاح کرنا رہا ہے۔

(وَقال المسیح یا بنی اسرائیل اعبدوا اللّٰہ ربّی وربّکم)سورہ مائد۔ آیت ۷۲)

اور حضرت عیسیٰ نے کہا کہ اے بنی اسرائیل! اللہ کی عبادت کرو جو میرا اور تمہارا رب ہے۔

(والی عادٍ اخاھم ھودا قال یا قوم اعبدو اللّٰہ مالکم من الہٍ غیرہ) سورہ الاعراف۔ آیت ۶۵)

ترجمہ: اور ہم نے قوم عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو بھیجا۔ انہوں نے فرمایا کہ اے میری قوم! تم اللہ کی عبادت کرو۔ اس کے سوا کوئی تمہارا معبود نہیں

(والی ثمود اخاھم صالحا قال یا قوم اعبدو اللّٰہ مالکم من الہ غیرہ)سورہ الاعراف۔ آیت ۷۳)

ترجمہ: اور ہم نے قوم ثمود کی طرف ان کے بھائی حضرت صالح کو بھیجا۔ انہوں نے فرمایا کہ اے میری قوم! تم اللہ کی عبادت کرو۔ اس کے سوا کوئی تمہارا معبود نہیں۔

(ولقد بعثنا فی کل امۃ رسولا ان اعبدوا اللہ واجتنبو الطاغوت)

ترجمہ: اور ہم نے ہر قوم کے لئے ایک پیغمبر بھیجا تاکہ خدا کی عبادت کرے اور طاغوت سے پرہیز کرے۔

(وما ارسلنا من قبلك من رسول الا نوحی الیہ انہ لاالہ الا انہ فاعبدون)

(سورہ الانبیاء۔ آیت ۹۲)

لہٰذا اسلامی حکومت کو دینی اعتقادات کی قدروں کی حفاظت کرنی چاہئے اور تبلیغی اعتبار سے اس طرح سرگرم عمل ہونا چاہئے تاکہ دشمنان اسلام کی تبلیغی سازشوں کو

جو ہمہ وقت اسلامی عقائد کی بنیاد کو کھوکھلا کرنے میں لگی ہوئی ہیں، پوری طرح ناکام بنا سکیں۔ کیونکہ جب تک اس اہم مسئلہ کی طرف توجہ نہ کی جائے گی اور اس رکاوٹ کو دور نہیں کیا جائے گا اس وقت تک دین اور شریعت خداوندی کی حاکمیت کمال کو نہیں پہنچ سکتی۔

۲۔ اخلاقی عقائد کی نگہبانی اور اخلاقی مفاسد وبدعنوانیوں سے دوری وعلیحدگی:

تمام انبیاء علیہم السلام بخوبی جانتے تھے کہ اخلاقی اصلاح کے بغیر خدا کے دین اور شریعت کی حاکمیت مکمل طور پر روئے زمین پر نافذ نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ انسان عدم تحفظ کا شکار ہو جاتا ہے اور اس سے نجات نہیں پاتا اور تاریخ میں اپنا اہم رول ادا نہیں کر سکتا۔

(والتین الزیتون وطورسینین وھذاالبلد الامین لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم ثم رددناہ اسفل سافلین)۔ سورہ تین۔ آیت ۱تا۵

ترجمہ: قسم ہے انجیر کی اور زیتون کی اور طور سینین کی اور اس امن والے شہر کی۔ یقیناً ہم نے انسان کو بہترین صورت میں پیدا کیا۔ پھر اسے نیچوں سے نیچا کر دیا۔

اس آیۂ کریمہ کے ذیل میں استاد ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں۔

''جو لوگ ملامت آمیز اخلاقی مفاسد ولعنتوں مثلاً حرص، طمع خود پسندی، شہوت پرستی، نشیلی اشیاء کے دلدادہ، غصہ وحسد اور دیگر برے اعمال وافعال کے عادی ہو جاتے ہیں ان کے بارے میں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ وہ ذلت ورسوائی کے سب سے نچلے طبقے میں گر چکے ہیں۔[۱]

پس روئے زمین پر خداوند عالم کے دین اور اس کی شریعت کی حاکمیت کے لئے اخلاقی مفاسد اور بدعنوانیوں کے خلاف جدوجہد کرنا نہایت اہم اور لازمی ہے کیونکہ اس

کے بغیر اس کام میں کامیابی حاصل کرنا قطعی ناممکن ہے۔

۳۔ سلوک ور فتار کی حفاظت ونگہداری

خداوند قدوس فرماتا ہے:

(مایلفظ من قول الآ لدیه رقیب عتید)سورہ ق۔ آیت ۱۸)

انسان منہ سے کوئی لفظ نکال نہیں پاتا مگر کہ اس کے پاس نگہبان تیار ہے۔

(وکان اللّٰہ علی کل شیٔی رقیبا)سورہ الاحزاب۔ آیت ۵۲

اور اللہ ہر چیز کا نگہبان ہے۔

(وانّ علیکم لحافظین کراماً کاتبین)

اور بیشک تمہارے اوپر نگہبان رکھے گئے جو کہ محترم ہیں اور تمہارے اعمال کو لکھتے ہیں۔

جملہ انبیاؑ نے اس بات کی بھرپور کوشش کی ہے کہ لوگ راہ ایمان پر گامزن رہیں اور ان کی راہ روش پر کڑی نگاہ رکھی جائے اور نظارت ونگہبانی کا یہ کام اس طرح انجام دیا جائے کہ ہر شخص خود ہی اپنے اعمال کا محافظ وپاسبان ہو۔

اسلامی حکومت دراصل معاشرہ کی حفاظت ونگہبانی کرتی ہے تاکہ سماج کسی قسم کی سماجی، اقتصادی اور سیاسی پریشانی میں مبتلا نہ ہونے پائے۔ کیونکہ جو خطرات اور امراض معاشرہ میں تباہی لائیں ان کا تدارک اسکے علاج سے بہتر ہے۔

اگر روئے زمین پر دین وشریعت کو عملی جامہ پہنانے والوں پر کڑی نگاہ نہ رکھی جائے تو وہ اکثر اوقات دین اور شریعت کے نام پر ایسے کام کے مرتکب ہو سکتے ہیں جن کا حساب تو دین کے کمانے میں لکھا جائے گا لیکن دین اور ان کے اعمال کے درمیان کوئی رشتہ نہ ہوگا۔

۴۔شر و فساد کے عوامل کی نفی و تردید۔

خدائے تعالیٰ فرماتا ہے:

(ولولا دفع اللّٰہ النّاس بعضھم ببعض لّفسدت الارض)سورہ بقرہ۔ آیت ۲۵۱۔

اگر اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کو بعض سے دفع نہ کرتا تو زمین میں فساد پھیل جاتا۔

(ولا تبغ الفساد فی الارض)آیت ۷۷ سورہ القصص۔

اور زمین میں فساد مت پھیلاؤ۔

(ولا تعثوافی الارض مفسدین) سورہ الاعراف آیت ۷۴

ترجمہ :اور زمین میں فساد مت پھیلاؤ۔

قرآن کریم میں فساد اور شر کی تردید سے متعلق آیات اتنی زیادہ ہیں کہ ان سب کا خلاصہ یہاں ممکن نہیں۔ کیونکہ دین کی اکثر ترقی یافتہ ثقافتوں قوموں اور ملتوں کی ہلاکت کی سب سے بڑی وجہ ہے یہی اخلاقی شر و فساد رہا ہے۔

(الم ترکیف فعل ربّک بعاد ارم ذات العماد التی لم یخلق مثلھا فی البلاد وثمود الذین جابو الصخر بالواد وفرعون ذی الاوتاد الذین طغو فی البلاد فاکثرو فیھا الفساد فصب علیھم ربک سوط عذاب ان ربک لبالمرصاد)سورہ الفجر۔ آیت ۶ تا ۱۴

کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ آپ کے رب نے عادیوں کے ساتھ کیا کیا۔ ستونوں والے ارم کے ساتھ جس کی مانند کوئی قوم ملکوں میں پیدا نہیں کی گئی اور ثمودیوں کے ساتھ جنہوں نے وادی میں بڑے بڑے پتھر تراشے تھے۔اور فرعون کے ساتھ جو میخوں والا تھا۔

ان سبھوں نے شہروں میں سر اٹھا رکھا تھا اور بہت فساد مچا رکھا تھا۔ آخر تیرے رب نے ان سب پر عذاب کا کوڑا برسایا یقیناً تیرا رب گھات میں ہے۔

پس لوگ اسی وقت خدا کی حاکمیت کے تابع و فرمانبردار ہو سکتے ہیں جب وہ فساد (برائی) اور اس کے دیگر شکلوں سے آزاد اور مکمل نجات حاصل کر چکے ہوں۔ اور اسلامی حکومت کو چاہئے کہ رفع شر و فساد کو اپنے مقاصد میں شامل کرے۔

ج۔ دنیا میں عدل و انصاف کی اشاعت:

در حقیقت دنیا میں عدل و انصاف کی اشاعت کرنا اسلامی حکومت کا بنیادی مقصد ہے۔

(ان اللّٰہ یامر کم ان تؤدوا الامانات الی اھلھا واذاحکمتم بین النّاس ان تحکمو ابالعدل) سورہ النساء۔ آیت ۵۸)

اللہ تعالیٰ تمہیں تاکیدی حکم دیتا ہے کہ امانت والوں کی امانتیں انہیں پہنچاؤ اور جب لوگوں کا فیصلہ کرو تو عدل و انصاف سے فیصلہ کرو۔

(ان اللہ یامرکم بالعدل والاحسان) سورہ نحل آیت ۹۰

اللہ تعالیٰ عدل کا، بھلائی کا حکم دیتا ہے

(وامرت لا عدل بینکم) سورہ شوریٰ۔ آیت ۱۵

اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تم میں انصاف کرتا رہوں۔

(وان حکمت فاحکم بینھم بالقسط ان اللہ یحبُّ المقسطین) سورہ المائدہ۔ آیت ۴۲

اور اگر تم فیصلہ کرو تو ان میں عدل وانصاف کے ساتھ فیصلہ کرو، یقیناً عدل والوں کے ساتھ اللہ محبت رکھتا ہے۔

(شهد الله انه لااله الا هو والملائكة واولو العلم قائماً بالقسط)
ترجمہ :اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے کہ سوائے اس کے کوئی معبود نہیں اور فرشتے اور صاحب علم لوگ بھی اس حقیقت کی گواہی دیتے ہیں کہ اللہ اپنے بندوں کے درمیان عدل وانصاف سے کام لیتا ہے۔

چنانچہ ہر مومن کا مقصد اور عقیدہ عدل وانصاف ہونا چاہئے۔اور اسلامی حکومت کو بھی چاہئے کہ معاشرہ میں عدل وانصاف نافذ کرنے کی غرض سے اسے اپنے مقاصد کا جز تسلیم کرے اور اس کی طرف توجہ دیتے ہوئے اسے عمل میں لائے اور مناسب یہ ہے کہ مندرجہ ذیل امور کی رعایت کرے۔

۱۔ انتظامات کی ذمہ داری لایق اور اہل لوگوں کو دینی چاہئے تاکہ حکومتی امور کو انجام دیتے وقت عدل وانصاف کو اپنے پیش نظر رکھیں۔ جیسا کہ اس سے قبل اس کا تذکرہ سورہ النساء کی ۵۸ ویں آیت میں کیا جاچکا ہے جو اس بات کی گواہی دیتا ہے۔ پیغمبرؐ اور خلفاء راشدین کے طریقے سے اس حقیقت کی تصدیق ہو جاتی ہے۔لہٰذا مزید وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔

جملہ امور میں عدل وانصاف کو فراموش نہ کیا جائے۔
(ولا يجرمنّكم شنانُ قومٍ على الا تعدلوا اعدلوا هو اقربُ للتقوىٰ۔
اس جرم میں نہ پھنسوادے کہ تم ناانصافی کرنے لگو (خبردار (بلکہ تم ہر حال میں انصاف کرو یہی پرہیزگاری سے بہت قریب ہے۔ (سورہ مائدہ آیت ۸)

پس عدل وانصاف کے اجراء اور خیر ونیکی کی تبلیغ واشاعت کرتے وقت تمام پہلوؤں کو نگاہ میں رکھنا لازمی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی معاشرہ کے ایک پہلو کی طرف

زیادہ توجہ کی وجہ سے معاشرہ کی دوسری ضرورتوں کو پورا نہ کیا جاسکے۔اگر ایسا ہوا تو یہ قطعی مناسب نہ ہوگا کیونکہ اسلامی نظام حکومت کا مقصد سماج کے تمام شعبوں کے درمیان توازن قائم کرنا ہے۔ مثال کے طور پر ترقی کی ضرورت کو پورا کرتے وقت معاشرہ کے دیگر شعبوں کی ضرورت کا توازن نہ بگڑنے پائے یا کوئی دوسری پریشانی نہ اٹھ کھڑی کیونکہ اسلامی حکومت کا مقصد بہر حال عدل وانصاف ہونا چاہئے اور مرحلہ عدالت تک پہونچنے کے لئے بہر حال کچھ ضرورتوں کی تکمیل لازمی ہوتی ہے لیکن ان ضرورتوں کی تکمیل بھی عدل وانصاف پر مبنی ہونی چاہئے تاکہ سماج کا توازن برقرار رہے اور کوئی نئی پریشانی نہ آجائے۔

☆☆☆☆

حوالے:

۱۔المعالم فی الطریق۔سید قطب ص۔۲۷۴

۲۔ تفہیم القرآن جلد ۴ ص۔۴۰۶ المنصورہ

ولادت باسعادت صدیقۂ طاہرہ

جناب فاطمہ زہرا صلوات اللہ علیہا

کے موقع پر

پُرخلوص مبارک باد

قبول فرمائیں۔

وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

جناب سید شاہد مہدی
سے
ملاقات و گفتگو

انقلاب اسلامی ایران کی کامیابی کے بعد ہر سال ربیع الاوّل کے مہینے میں تہران میں عالم اسلام کی نمایاں علمی و ثقافتی شخصیتوں کا ایک عظیم الشان اجتماع منعقد ہوتا ہے جس کا مقصد مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے درمیان اتحاد و ہم آہنگی قائم کرنا رہا ہے۔

گذشتہ دور میں بھی وحدت واتحاد کی ضرورت تھی اور آج بھی ہے۔اس حقیقت کو نگاہ میں رکھتے ہوئے ہر سال کی طرح امسال بھی تقریب بین المذاہب اسلامی کی خاطر مسلمان دانشوروں کا ایک عالمی اجتماع تہران میں منعقد ہوا جس میں ہندوستان کی نمائندگی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر سید شاہد مہدی صاحب نے کی۔

واضح رہے کہ وائس چانسلر کا عہدہ سنبھالنے سے قبل شاہد مہدی صاحب نے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی سے امتیازی حیثیت سے ایم اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد تقریباً ۴ سال تک علیگڑھ اور کرکھیتر یونیورسٹیوں میں لکچرر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ۱۹۶۳ء میں موصوف نے آئی۔اے۔ایس امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔اس کے بعد وہ حکومت بہار کے مختلف سرکاری اداروں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے اور اپنی زندگی کا بہت بڑا حصہ ملک کے باہر عالمی تنظیموں اور اداروں میں ھندوستان کی نمائندگی میں بسر کیا

اور ہر شعبہ میں عظیم الشان کامیابی حاصل کرتے رہے۔اقوام متحدہ میں وہ تقریباً دس سال تک نمایاں عہدے پر کام کرتے رہے اور حکومت ہند نے ان کی غیر معمولی خدمات اور ان کے بیش قیمت تجربات کو نگاہ میں رکھتے ہوئے مارچ ۲۰۰۰ء میں انہیں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا وائس چانسلر بنادیا گیااور سر دست وہ اس مرکزی یونیورسٹی کی تعمیر و ترقی میں ہمہ تن سر گرم ہیں۔

تہران سے واپسی کے بعد فصلنامہ راہ اسلام کے ساتھ اپنی خصوصی ملاقات و گفتگو کے دوران انہوں نے بتایا کہ میں تہران میں منعقد تقریب بین المذاہب سے متعلق ایک سمینار میں شرکت کی غرض سے ایران گیا تھا جس کا موضوع محبت اہلبیت سے متعلق تھااور میری نظر میں یہ موضوع اس وجہ سے اور زیادہ اہمیت کا حامل تھا کہ تمام اسلامی فرقے محبت اہلبیت کو دل وجان سے تسلیم کرتے ہیں۔" انہوں نے مزید فرمایا کہ میں نے اس سمینار میں "صوفیاء اور اہلبیت" کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا جس میں دلائل و شواہد کے ذریعہ اس حقیقت کی نشاندہی مقصود تھی کہ صوفیاء نے دیگر اقوام و ملل کے درمیان مذہب اسلام کی تبلیغ واشاعت میں نمایاں کردار ادا کیا ہے اور اہلبیت علیہم السلام سے اپنی غیر معمولی عقیدت و محبت کی وجہ سے خصوصاً ہندوستان میں عزاداری کی ابتداء میں بھی ان بزرگوں نے کلیدی کردار ادا کیا ہے۔

جب ان سے یہ پوچھا گیا کہ کیا اس سے قبل بھی آپ ایران جاچکے ہیں تو انہوں نے فرمایا کہ "میں ۷۸-۱۹۷۷ء کے دوران ایران گیا تھا۔ اس وقت کی فضا ایک بڑی تبدیلی کی نشاندہی کر رہی تھی۔ اپنے مختصر قیام کے دوران میں نے دیکھا کہ تہران یونیورسٹی کے چاروں طرف مسلح فوجی تعینات ہیں اور نوجوان نسل کی آواز پر پابندی لگی

ہوئی ہے اوران کے انقلابی خیالات اندر ہی اندر پک رہے ہیں۔ میں نے ایک سنیما گھر کے سامنے نوجوانوں کی لمبی لمبی قطاریں دیکھی۔ اس سنیما گھر میں فلم "خاک" کی نمائش چل رہی تھی جس میں ایران کے دیہاتوں اور کسانوں کی بدحالی کا منظر پیش کیا گیا تھا اور لوگ کافی بڑی تعداد میں اس فلم کو دیکھنے کے لئے جمع تھے۔ ایرانی نوجوانوں کے چہرے سے حکومت کے خلاف ان کے غم وغصہ کی جھلک صاف نظر آرہی تھی۔ کچھ ہی دنوں بعد فروری ۱۹۷۹ء میں امام خمینی کی قیادت میں انقلاب اسلامی انقلاب ایران نے نمودار ہوا۔

انہوں نے اپنی گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ دو دہائی سے بھی کچھ زیادہ طویل عرصہ کے بعد جون ۲۰۰۱ء میں جب میں دوبارہ ایران پہونچا تو دیکھا کہ تہران کا ڈھانچہ کافی بڑھ گیا ہے اور اس ملک نے ہر شعبۂ حیات میں قابل ذکر و قابل توجہ کامیابی حاصل کرلی ہے۔ شاہد مہدی صاحب نے بتایا کہ چند سال پہلے اقوام متحدہ زراعتی اور غذائی تنظیم (FAO) کی ایک مبسوط رپورٹ کے مطابق ایران نے انقلاب کے بعد زراعتی پیداوار میں اور دیہی زندگی کو بہتر بنانے میں غیر معمولی ترقی کی ہے۔ یہ ایک خوش آیند بات ہے اس لئے کہ کسی بھی ملک کی فلاح اور مضبوطی کے لئے زراعت اور دیہی پروگراموں کی ترقی لازمی ہوا کرتی ہے۔ بہر حال ہندوستان کی ایک مرکزی یونیورسٹی کے خادم کی حیثیت سے تعلیمی شعبوں میں ایران نے جو غیر معمولی ترقی حاصل کی ہے وہ میری دلچسپی کا خاص موضوع قرار پائی۔

ایران کے ڈپٹی وزیر تعلیم جناب خانیکی نے بتایا کہ ایران میں پرائیویٹ اور پبلک سیکٹر میں اعلیٰ تعلیمی ادارے موجود ہیں اوران اعلیٰ درسگاہوں میں تعلیم حاصل کرنے والوں میں خواتین کی تعداد مردوں کے تقریباً برابر ہے۔ وزیر موصوف نے بتایا کہ ۹۹-۱۹۹۸ء

کے دوران یونیورسٹی کی سطح پر تعلیم حاصل کرنے والوں کی کل تعداد تین لاکھ پچاس ہزار افراد پر مشتمل تھی جس میں خواتین کی تعداد قابل توجہ ہے۔ پرائیویٹ یونیورسٹی میں ان کی تعداد ۵۳٪ اور سرکاری یونیورسٹیوں میں یہ تعداد ۴۵٪ تھی۔ اعلیٰ تعلیم کے شعبہ میں معلم و طالب علم کے درمیان ایک معلم کیلئے ۲۱ طالب علموں کی شرح تسلیم کی گئی ہے۔

اعلیٰ تعلیم کے وزیر معاون نے یہ اطلاع بھی فراہم کی کہ ایران میں ہر صوبے میں ایک یونیورسٹی کا وجود لازمی ہے اور ایران کی موجودہ نوجوان نسل تکنیکی تعلیم، زراعت، علاج و معالجہ اور انجینئرنگ کی مختلف شاخوں میں خصوصی دلچسپی رکھتی ہے اور ایران کے مجموعی قومی بجٹ کا ساڑے تین فیصد اعلیٰ تعلیم کے لئے مخصوص ہے۔

تہران پہونچنے کے بعد مجھے یہ پتہ چلا کہ اس ملک میں خواتین کی اعلیٰ تعلیم کی طرف خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ ملک کی کسی بھی یونیورسٹی میں وہ اپنا تعلیمی سلسلہ جاری رکھنے کے لئے پوری طرح آزاد ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ تہران میں فاطمہ زہراؑ یونیورسٹی بھی ہے جس میں خصوصی طور پر صرف خواتین کی اعلیٰ تعلیم کا اہتمام کیا گیا ہے اور اس خصوصی درسگاہ میں زبان و ادب اور سماجی و سیاسی علوم کے علاوہ تکنیکی تعلیم کا بھی بندوبست کیا گیا ہے۔

مجموعی اعتبار سے ایران نے ہر شعبۂ حیات میں غیر معمولی ترقی حاصل کرلی ہے۔ جس روز میں ایران پہونچا وہاں عام چناؤ ہو رہے تھے۔ لوگ لمبی لمبی قطاروں میں ووٹ ڈالنے کے لئے کھڑے ہوئے تھے اور انتہائی پر امن طریقے سے اپنی پسند کی حکومت کی تشکیل کا ارادہ رکھتے تھے۔ انقلاب کے بعد ایران کی صورتحال کافی اچھی ہوگئی ہے۔ مرکز کے ساتھ ہی ساتھ صوبائی اور علاقائی ترقی پر خصوصی زور دیا جارہا ہے ایرانی حکومت نے

کافی حد تک آزاد ماحول فراہم کر دیا ہے چنانچہ مختلف خیالات اور حکمت عملی والے اخبارات اور اور رسائل کی اشاعت پر کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ ایران کے اکثر بڑے اشاعتی مراکز اور کتابوں کی دوکان تہران یونیورسٹی کے اطراف میں واقع ہیں جہاں ہر موضوع پر کتابیں دستیاب ہیں اور اس سلسلے میں کسی قسم کی کوئی سختی یا پابندی نہیں نظر آئی۔ کتابیں کارل مارکس اور فرائڈ پر بھی دکھائی دیں۔ سرکاری طور پر تو ایران میں SateliteT.V نہیں ہیں۔ لیکن غیر سرکاری طور پر یقیناً موجود ہیں۔ ساری فلمیں بھی دستیاب ہیں۔ خواتین کے پردہ کے سلسلے میں کوئی زور زبردستی تو نہیں دکھائی دیتی لیکن خواتین کے لئے یہ لازمی ہے کہ وہ اپنا سر ڈھکے رہیں۔

وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ شاہد مہدی صاحب نے مزید فرمایا کہ نوجوانوں سے گفتگو کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ مزید آزادی چاہتے ہیں مگر اس کا واضح اظہار نہیں کرپاتے۔

ایران میں متوقع سیاسی تبدیلی کے بارے میں سوال کیا گیا تو شاہد مہدی صاحب نے زور دیتے ہوئے فرمایا کہ ایران میں باہری دباؤ کے ذریعہ کسی تبدیلی کا خواب دیکھنا بے سود ہے۔ ایرانی معاشرہ کا ڈھانچہ کچھ اس طرح کا ہے کہ اس میں آہستہ آہستہ ہی کسی تبدیلی امید کی جاسکتی ہے جو ایرانی سماج کے اندر سے ہی ابھر کر سامنے آسکتی ہے۔ البتہ جو لوگ یہ امید لگائے بیٹھے ہیں کہ ایران میں انقلاب سے پہلے والی صورتحال واپس آنے والی ہے انہیں مایوسی ہوگی۔ اسلامی انقلاب سے قبل ایران میں کمال اتاترک کی پیروی میں بناوٹی مغربیت طاری کی گئی تھی جو بظاہر نابود ہوچکی ہے اور جس کی دوبارہ ترویج کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

ایران میں چند روزہ قیام کے دوران محسوس ہوا کہ ملک کے عدالتی نظام میں بھی اصلاحات ہو رہی ہیں اور عدالتی اداروں سے وابستہ افراد کی لازمی ٹریننگ و تربیت وغیرہ کا اہتمام کیا جارہا ہے جو یقیناً ایک مستحسن عمل ہے۔

ایرانی عوام باہر کی دنیا کے بارے میں زیادہ سے زیادہ اطلاعات حاصل کرنا چاہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ دنیا کے اکثر ملکوں کا اچھا ادب کثیر تعداد میں فارسی زبان میں موجود ہے اور یہ ادب وافر مقدار میں ایران کے بازاروں میں دستیاب ہے اور اس پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں ہے لیکن پچھلی صدی کے دوران خود ایران میں جو ادب پیدا ہوا ہے اس کے تراجم کم ہیں اور ایرانی ادب کو دنیا کی دیگر زبانوں میں پیش کرنے کے لئے کوئی اہم قدم نہیں اٹھایا گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر اس سلسلے میں کوئی موثر قدم اٹھایا جائے تو دنیا ایرانی ادب کا استقبال کرے گی کیونکہ ایران کو دنیا کے ان ملکوں میں بہر حال ایک نمایاں حیثیت حاصل رہی ہے جو صدیوں سے علم وادب کے علمبردار رہے ہیں۔ ایران کو اپنے ادبی اور ثقافتی سرمایہ سے خصوصی اور غیر معمولی لگاؤ رہا ہے اور ہر دور حکومت میں ادبی میراث کی حفاظت کا اہتمام بدرجۂ اتم دکھائی دیتا ہے شائد یہی وجہ ہے کہ آستانۂ قدس رضویہ، مشہد کی لائبریری کو دنیا کی عظیم لائبریریوں کے درمیان ایک مثالی حیثیت حاصل رہی ہے اور پرانے مخطوطوں کی حفاظت کی جدید ترین تکنیک اسی لائبریری میں دکھائی دیتی ہے۔

فارسی زبان وادب کے سلسلے میں پوچھے گئے ایک سوال کے جواب میں شاہد مہدی صاحب نے فرمایا کہ اس میں کوئی دورائے نہیں کہ فارسی ادب انسان دوستی پر مشتمل ہے اور دنیا کے جملہ علوم وفنون اور ادیان ومذاہب پر فارسی زبان میں بیش قیمت

سرمایہ موجود ہے۔ سعدی کی انسان دوستی کا پیغام اقوام متحدہ کے صدر دروازہ پر اکندہ ہے اور حافظ کا پیغام عشق آج بھی زبان زد خاص وعام ہے۔ لیکن سردست ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ اس وقت ہندوستان میں فارسی روبہ زوال ہے اور اگر خاص توجہ نہ دی گئی تو اس کا تدریجی زوال یقینی ہے۔ لہٰذا اگر ہندوستان میں فارسی زبان وادب کی بقا مقصود ہے تو دونوں ملکوں کے درمیان عملی ثقافتی تعاون میں اضافہ کی ضرورت ہے۔

اپنی گفتگو کے آخری حصہ میں شاہد مہدی صاحب نے صدر جمہوریہ اسلامی ایران حجت الاسلام سید محمد خاتمی کی اس تجویز کی بھرپور تائید وستائش کی جس میں انہوں نے عالمی تہذیبوں کے درمیان مذاکرہ وگفتگو کی بات کہی ہے اور تباہی کے کگار پر کھڑی ہوئی دنیائے بشریت کو بات چیت کے ذریعہ مسائل کا حل تلاش کرنے کی تلقین کی ہے۔ درحقیقت ان کی یہ تجویز Huntington کے اس کلیہ کا بہترین جواب ہے جس میں اس نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ دنیا کی تہذیبوں کے درمیان ٹکراؤ کی صورتحال پائی جاتی ہے اور ان کے درمیان قربت ونزدیکی کا امکان کم ہے۔

☆☆☆

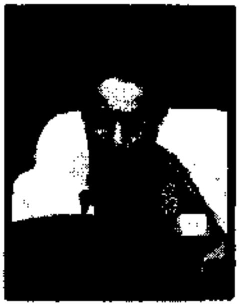

تہران میں
حمایت فلسطین عالمی کانفرنس سے
صدر جمہوریہ ایران
حجت الاسلام سید محمد خاتمی کا خطاب

دنیائے انسانیت اس حقیقت سے بخوبی واقف ہے کہ امریکی اور برطانوی حمایت کے سایہ میں مٹھی بھر صہیونی جلادوں نے طاقت اور مہلک اسلحوں کے ذریعے لاکھوں فلسطینی عوام کو ان کے ملک سے باہر نکال دیا اور گذشتہ پچاس سال سے لیکر آج تک شاید ہی کوئی دن ایسا گذرا ہو جب فلسطینی مظلومین کو گولیوں سے بھونا نہ گیا ہو۔ ابتدائی مرحلے میں امریکہ، برطانیہ اور سوویت یونین تینوں ان یہودی جلادوں کی حمایت کر رہے تھے اور جب برطانوی سامراج کا بڑھاپا آگیا تو دنیا کی دونوں مشرقی اور مغربی بڑی طاقتیں فلسطنیوں کی نابودی میں ہمہ تن سرگرم ہو گئیں اور سوویت یونین کے زوال کے بعد دنیا کی اکلوتی عظیم طاقت امریکا نے ایک طرف تو کیمپ ڈیوڈ معاہدہ کے ذریعہ عالمی صلح اور عرب اسرائیل سمجھوتے کا ڈھونگ رچاتے ہوئے اسرائیل کو لازمی بین الاقوامی شناخت سے مالامال کر دیا اور دوسری طرف مقبوضہ فلسطین کے ایک مختصر سے خطے میں یاسر عرفات کو بے تاج بادشاہ بنا کر فلسطینیوں کا قتل عام شروع کر دیا اور آج ہم دیکھتے ہیں کہ ہر روز بے گناہ

فلسطینی نوجوان بے رحمانہ انداز میں قتل کیے جا رہے ہیں اور دنیا کی بے شمار نام نہاد انسانی حقوق سے وابستہ تنظیموں پر موت کا سناٹا چھایا ہوا ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فلسطین میں مارے جانے والے بیگناہ مسلمان نوجوان ان تنظیموں کی نظر میں انسان نہیں ہیں۔

واضح رہے کہ اسلامی جمہوریہ ایران نے شروع ہی سے فلسطینی مظلوموں کی اعلانیہ حمایت میں ذرہ برابر ہچکچاہٹ نہیں محسوس کی۔ ایران بانگ دہل اعلان کرتا رہا کہ عرب دوستو! یہ معاہدہ صلح درحقیقت اسلام اور مسلمانوں کی ذلت و رسوائی کا طوق ہے جو تمہارے گلے میں ڈالا جا رہا ہے اس سے دھوکا مت کھاؤ اور اچھی طرح سمجھ لو کہ فلسطین کی نجات کا واحد ذریعہ و وسیلہ خدا کی لازوال طاقت سے بھرپور وابستگی ہے۔اللہ کی عظیم طاقت پر بھروسہ کرتے ہوئے فلسطینی مجاہدین انتفاضہ نامی تنظیم کے سایہ میں آگے بڑھے اور خدا کا شکر ہے کہ فلسطینی مجاہدوں نے اپنی معرکت الآراء شجاعت اور جانبازی کے ذریعے صہیونی جلادوں کے حوصلے پست کر دئے اور آج محاذ جنگ پر دشمن کی توپوں کا مقابلہ کرنے والا فلسطینی مجاہد اپنے ساتھیوں کو یہ پیغام دیتے ہوئے شہادت سے ہم آغوش ہو رہا ہے کہ ذلت کی سیاہ موت سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ عزت کی سرخ موت کو گلے لگاؤ اور دشمنوں کا مقابلہ کرتے ہوئے شہادت سے ہم آغوش ہو جاؤ۔

ایران کی موجودہ اسلامی جمہوری حکومت نے کچھ دنوں قبل تہران میں حمایت فلسطین عالمی کانفرنس کا اہتمام کیا تھا جس میں دنیا کے مختلف اسلامی ممالک کے مندوبین نے شرکت فرمائی تھی۔ذیل میں اس کانفرنس سے صدر جمہوریہ ایران عزت مآب سید محمد خاتمی صاحب کا خطاب حاضر خدمت ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسلامی تنظیموں کے سر براہان محترم، گرانقدر عوامی نمایندگان، باعث عزت واحترام محققان ودانشمندان نامور، ہر دلعزیز مجاہدین ومہمانان گرامی!

ابتدائی مرحلہ میں، میں اسلامی جمہوریہ ایران اور بالخصوص عظیم الشان وگرانقدر تجربات سے مالامال ملت اسلامیہ ایران کی جانب سے اس سر زمین پر آپ لوگوں کا پرخلوص استقبال وخیر مقدم کرنا چاہتا ہوں اور اس اہم اجلاس کی تشکیل کو محض ایک دینی فریضہ ہی نہیں بلکہ بہادر اور مظلوم فلسطینی عوام کا بنیادی حق تسلیم کرتا ہوں۔

فلسطین درحقیقت فقط کسی ایک سر زمین کا نام نہیں ہے بلکہ یہ انسانی تاریخ وتمدن اور فرہنگ وثقافت کا خلاصہ ہے۔"بیت المقدس" اس طولانی تاریخ بشریت کے دوران ادیان ومذاہب اور انسانوں کے درمیان مذاکرہ وگفتگو کا سر آغاز رہا ہے۔ مسجد الاقصیٰ مسلمانوں کا قبلۂ اول۔ خداوند عالم کے بندۂ محبوب کی معراج اور حریم امن خداوندی ہے۔ ارشاد خداوندی ہے۔

"سبحان الذی اسریٰ بعبده لیلا من المسجد الحرام الی المسجد الاقصی الذی بارکنا حوله لنریه من آیتنا انه هو السمیع البصیر۔"

اس مقدس سر زمین اور اس ٹھوس ومستحکم قوم کی برکتوں میں سے بس اتنا ہی کافی ہے کہ اس کی جڑیں ہر انسان اور ہر قوم کے احساس اور اس کی فکر کی گہرائی میں پھیلی ہوئی ہیں۔ فلسطین کا نام آزادی اور انسانی امید کی یاد تازہ کردیتا ہے۔ جہاں کہیں بڑے رنج ومصائب کا ذکر آتا ہے وہاں فلسطین کا خونیں افق عظیم تر ثابت قدمیوں کے دروازے کو کھول دیتا ہے اور آزادی وکامیابی کی خوشخبری دینے لگتا ہے اور یہ سب کچھ درحقیقت موجود

ہ دنیا میں ایک مستقل فرہنگ و ثقافت اور ایک آزاد قوم کی حق پسندی کی برکت ہے۔

بیت المقدس کی آواز ایک طویل مدت سے دنیائے بشریت کے کانوں سے ٹکرا رہی ہے۔ یہ مختلف انسانوں کی قربت و ہمدلی اور مختلف ادیان و مذاہب کے درمیان میل جول کی جیتی جاگتی آواز ہے۔ اس آواز کو کان لگا کر سننا چاہئے اور ان سیاسی ہتھکنڈوں کا ڈٹ کر مقابلہ بھی کرنا چاہئے جن کی وجہ سے یہ مقدس وادی برسوں سے مٹھی بھر لوگوں کی نسل پرستانہ اور ظالمانہ ہوس کی قربان گاہ بنی ہوئی ہے۔

حاضرین محترم!

میں آپ لوگوں کی اجازت سے آپ کی توجہ ملت فلسطین کے پامال شدہ حقوق اور ان پامال حقیقتوں کی طرف مبذول کرنا چاہتا ہوں جن کی شناخت و معرفت انسان کی اہم ذمہ داری ہے۔

آخر وہ کون سا طریقہ ہے جس کو بروی کا لاتے ہوئے سرزمین مشرق کے امن و سلامتی اور تہذیب و تمدن کے گہوارہ کو بدامنی اور بے گناہ انسانوں کے قتل و عام کا مرکز بنا دیا گیا؟ کیسے صدیوں سے ایک ساتھ محبت آمیز زندگی بسر کرنے والے مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں کو نسل پرستی کی بھینٹ چڑھا دیا گیا اور ایک ایسی ظالم و غاصب صہیونی حکومت برسر اقتدار آگئی جو علاقائی امن و سلامتی اور انسانی حرمت و حقوق کی بقا کے لئے زبردست خطرہ بن چکی ہے؟

فوجی جھگڑوں اور سیاسی کشمکشوں کے پیچھے جو کچھ ہو رہا ہے وہ در حقیقت خطرناک صہیونیت کا ظہور و فروغ ہے۔ صہیونیت کسی دین و آئین کا نام نہیں ہے بلکہ سماج و سیاست کے میدان میں خود پسندانہ اور نسلی امتیازات پر مشتمل فکری دباؤ کا نام ہے جس نے حضرت

—موسیٰ کے پاکیزہ دین کو اپنی شیطانی خواہشات کا کھلونا بنارکھا ہے۔ صہیونیت کا نہ یہودی مذہب کی الٰہی روح سے کوئی سروکار ہے اور نہ ہی آزاد منش یہودیوں سے اس کا کوئی واسطہ ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ انسانی حقوق اور سیاست کے اعلیٰ اصولوں اور معیاروں سے بھی اس کا کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صہیونیت کی بنیاد ذاتی فضیلت اور دوسروں کے حقوق کی پامالی ونابودی پر قائم ہے اور اسی غلط بنیاد پر ایک حکومت کی تشکیل کردی گئی ہے جس کی نظر میں انسانیت کے بنیادی اصولوں اور معیاروں کی کوئی اہمیت نہیں ہے اور جس نے اپنی ظالمانہ راہ وروش اور غیر معمولی بیرحمی کے ذریعہ دنیا کے نامور جلادوں کو پس پشت ڈال دیا ہے ''اسرائیل'' دراصل ''صہیونیت'' کا بھدا اور بدنما جلوہ اور انسانی عظمت اور حق وحقیقت کی بے حرمتی کا نمونہ ہے۔

ہمارا عقیدہ وایمان ہے کہ دنیا کے کسی گوشے میں کسی بھی انسان کو محروم ومرعوب اور مظلوم وپسماندہ نہ ہونا چاہئے۔ دنیا کی کسی قوم کے حقوق کو پامال نہ کیا جانا چاہئے یہی وہ مقدس بنیاد ہے جو انسانی زندگی کو معنی ومفہوم عطا کرتی ہے۔ اور دنیا کے تمام لوگوں پر یہ فریضہ عائد کرتی ہے کہ وہ ملت فلسطین کے غصب شدہ حقوق کی حفاظت وبحالی کے لئے لازمی قدم اٹھائیں۔ ملت مظلوم فلسطین میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو خون آلود فلسطینی سرزمین میں موجود ہیں اور وہ لوگ بھی شامل ہیں جو رنج ومصائب سے تنگ آکر دنیا کے مختلف علاقوں میں دربدری اور آوارہ وطنی کی زندگی بسر کررہے ہیں اور صہیونیت کی ظالمانہ ونسل پرستانہ ہوس کا شکار ہیں۔ اپنے پامال شدہ حقوق کی بحالی وبازیابی کے لئے ان کی جدوجہد عدل وانصاف پر مبنی ہے اور اس جدوجہد کی ہرممکن خدمت وحمایت کی جانی چاہئے۔

أذن للذين يُقَاتِلُون بأنهم ظلموا وان الله على نصرهم لقدير"

خواہران و برادران عزیز!

دنیا کو صلح و سلامتی کی ضرورت ہے اور یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ انسانی عدالت و شرافت اور عوام الناس کے مطالبات کو نگاہ میں رکھے بغیر دنیا کی کوئی بھی صلح مستحکم وپائدار نہیں ہو سکتی ہے۔ اس بنیادی اصول کو نگاہ میں رکھتے ہوئے مشرق وسطی علاقہ میں بھی اسی وقت ایک مستحکم صلح قائم ہو سکتی ہے جب ملت اسلامیہ فلسطین کے تمام جائز حقوق بحال ہو جائیں۔ جملہ آوارہ وطن فلسطینیوں کی وطن واپسی کا حق، اپنی قسمت کے بنانے اور سنوارنے کا حق، مقبوضہ علاقوں کی مکمل آزادی وبازیابی کا حق، مستقل، آزاد اور آباد وطن کی دولت سے مالا مال ہونے کا حق، پرامن زندگی بسر کرنے کا حق اور فلسطینی یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کو دوستانہ ماحول میں زندگی بسر کرنے کا حق اس علاقے میں ایک مستحکم صلح کی تشکیل کے لوازم ہیں۔ پس علاقے میں پھیلی ہوئی بدامنی کے اسباب وعوامل کا تجزیہ کرتے وقت اور ایک مضبوط صلح کی ناکامی کی وجہ تلاش کرتے وقت علاقے میں موجود نسل پرستانہ ماہیت کی حکومت کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے جو بین الاقوامی سطح پر تسلیم شدہ عام انسانی انفرادی اور اجتماعی حقوق کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہے۔ پس موجودہ صورتحال کو نگاہ میں رکھتے ہوئے آج صرف مسلمانوں ہی کی نہیں بلکہ عالمی انسانی برادری سے تعلق رکھنے والے ہر فرد کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ملت فلسطین کے جائز حقوق کی بحالی وبازیابی کے لئے اٹھ کھڑا ہو تاکہ علاقائی اور عالمی سطح پر ایک پائدار صلح کا قیام عمل میں آسکے۔ واضح رہے کہ کہ پانچ دہائیوں سے بھی زیادہ وقت گزر چکا ہے کہ فلسطینی عوام عام انسانی حقوق سے محروم ہیں اور فلسطینی مظلومین کے ان بنیادی حقوق کو خاموشی اور

سمجھوتوں کے فراموش خانے میں ڈال دیا گیا ہے۔ایک لمبی مدت گزر جانے کی وجہ سے فلسطینی عوام کے حقوق کو نہ تو فراموش کیا جاسکتا ہے۔اور نہ حقوق کی پامالی کی تنظیم کو میدان سیاست میں ایک عادت اور رویہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ فلسطین کے بہادر عوام کی تنظیم انتفاضہ کو ان بنیادی اصولوں سے باخبر اور ان پر مکمل اعتقاد وایمان رکھنا چاہئے۔ آج سر زمین فلسطین میں جو کچھ رونما ہو رہا ہے وہ در حقیقت ایک قوم کی عوامی بیداری و خود آگاہی کی تجلی ہے جس نے اپنی آزادی کے بنیادی حق کو دوبارہ حاصل کرنے کا ٹھوس ارادہ کرلیا ہے۔ یہ وہ اہم اور ابتدائی ترین حق ہے جس کو پوری دنیائے بشریت تسلیم کرتی ہے اور مظلوم و آوارہ وطن فلسطینی عوام اسی بنیادی حق کا مطالبہ کررہے ہیں اور بعض بڑی طاقتیں بالخصوص امریکہ ان کی راہ میں رکاوٹ بنا ہوا ہے۔

آج فلسطینی عوام ظالمانہ روابط اور صلح و سمجھوتوں پر مشتمل مکارانہ ہتھکنڈوں سے ناامید ہو کر انتفاضہ کی راہ وروش اختیار کرچکے ہیں اور اس تنظیم کے سایہ میں وہ نئی امید، نئے عزم و حوصلہ اور نئی وحدت سے مالامال ہو چکے ہیں۔ آج ملت اسلامیہ فلسطین کے بہادر نوجوانوں نے اپنے وطن کے مقدس پتھروں کے سایہ میں پناہ اختیار کررکھی ہے۔ معرکۂ انتفاضہ عوام کی شجاعت اور ان کے ایمان کی امید کا میدان اور طاقت و ظلم کی حاکمیت کی اعلانیہ تردید ہے۔اس کے علاوہ لوگوں کے دعوی اور ان کے عقائد کے تجزیہ کا معیار بھی یہی انتفاضہ ہے۔جو شخص عدالت و آزادی کی وسعت اور انسانی عظمت و حقوق کے دفاع کا خواہاں ہے اور اپنی اس خواہش پر اٹل ہے وہ اپنے آپ کو "انتفاضہ" سے الگ نہیں رکھ سکتا۔ فلسطین پر غاصبانہ قبضہ، فلسطینی عوام کی سرکوبی اور فلسطینی مردوں اور عورتوں کی ثابت قدمی کا چرچا مسلمانوں میں ہمیشہ رہا ہے اور آج دنیا کی آزاد قومیں بھی ان

حقائق کی طرف ہمہ تن متوجہ ہیں۔ مسئلہ فلسطین فقط حکومتوں کی حمایت کے دائرہ میں محدود نہیں ہیں بلکہ یہ وہ حقیقت ہے جو عوام الناس کے مطالبات سے ہی نہیں بلکہ عوامی تنظیموں، عالمی مفکروں ودانشوروں اور دنیا کی تمام آزادی طلب مسلمان قوموں سے پوری طرح جڑی ہوئی ہے ۔

فلسطین میں انصاف و آزادی کی تشکیل تمام مسلمانوں کی دلی خواہش اور ان کے درمیان وحدت و ہم آہنگی کا باعث ہے۔ اسلامی کانفرنس کی تشکیل اسی بنیاد پر عمل میں آئی اور دنیائے اسلام کی ذاتی طاقت کا ظہور اسی بنیاد پر ہوا۔ ہم لوگوں کو اس کی اس صلاحیت کو بخوبی پہچاننا اور اس کو عملی رنگ وروپ دینے کی کوشش کرنا چاہئے۔

انقلاب اسلامی ایران، اپنی ابتداء سے کامیابی کے مختلف مراحل تک اور اس کے بعد اسلامی جمہوریۂ ایران کے قیام سے لیکر آج تک فلسطین اور فلسطینیوں کے مستقبل کے بارے میں ہر ممکن غور وفکر میں سرگرم رہا ہے۔ ''آج ایران، کل فلسطین'' ہماری سرزمین کے صاحب عظمت شہیدوں کا نعرہ رہا ہے اور امام خمینیؒ کے ارمانات میں فلسطین کا نام سرفہرست رہا ہے اور فلسطینی عوام کے جائز حقوق کی بحالی آج بھی ایرانی عوام و حکومت کی دلی خواہش اور لازمی کوشش کا اہم حصہ ہے۔

اسلامی انقلاب کے قائد عظیم الشان حضرت آیت اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای کو فلسطینی عوام کے مستقبل اور صہیونیت کے خلاف لبنان میں انتفاضہ کی معرکہ آرائیوں سے خصوصی لگاؤ رہا ہے اور وہ پہلے ہی اعلان کر چکے ہیں کہ مشرق وسطیٰ کے بحران کا حل درحقیقت فلسطینی عوام کی تنظیم انتفاضہ کی بھرپور حمایت اور اس علاقے میں مستحکم صلح وسلامتی کی تشکیل سے جڑا ہوا ہے۔ اسلامی جمہوریۂ ایران کے صدر کی حیثیت سے میں بھی

دوحہ میں اسلامی ممالک کے سربراہوں کی کانفرنس میں اس موقف کا اعلان کر چکا ہوں اور آج آپ لوگوں کے سامنے دوبارہ اعلان کر رہا ہوں کہ مسئلہ فلسطین کے حل کے سلسلے میں درج ذیل باتیں غیر معمولی اہمیت کی حامل ہیں۔

۱۔ تمام فلسطینیوں کی ان کے اصلی اور حقیقی وطن یعنی مقبوضہ فلسطین میں واپسی

۲۔ ملک کے آئندہ نظام کے سلسلے میں کوئی آخری فیصلہ کرنے کے لئے اس سرزمین کے حقیقی مسلمان، عیسائی اور یہودی باشندوں کے درمیان استصواب عامہ کی تشکیل۔

۳۔ پورے ملک فلسطین میں فلسطینی عوام کی پسندیدہ حکومت کا قیام اور بیت المقدس کو فلسطین کا دارالحکومت بنانا۔

۴۔ اس سرزمین کے موجودہ باشندوں کے سلسلہ میں فلسطین کا آخری فیصلہ

محترم مندوبین اور گرانقدر حاضرین!

معرکۂ جنوب لبنان اور انتفاضہ دوم نے اس بات کو بے بنیاد ثابت کر دیا ہے کہ صہیونی حکومت کو شکست نہیں دی جاسکتی ہے۔ اس معرکہ آرائی نے فلسطینی عوام کی آنکھیں کھول دیں اور وہ اپنی جدوجہد کی راہ میں بڑے حوصلے کے ساتھ پیش قدم ہو گئے ہیں۔ اس حساس موقع پر ہملوگوں کا یہ فریضہ ہے کہ اس قوم کی بھرپور مدد کریں۔ اسی بنیاد پر میں نے مسلمان ملکوں کے غیر سرکاری اداروں اور تنظیموں نیز تمام حکومتوں کی مشترکہ کوشش سے غیر معمولی امید وابستہ کر لی ہے اور ان تمام حکومتوں اور غیر حکومتی اداروں سے درج ذیل باتوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے مشترکہ کوشش کا خواہاں ہوں۔

۱۔ فلسطینیوں کے خلاف صہیونی حکومت کے منصوبہ بند مظالم کی بھرپور اور اعلانیہ مذمت۔ واضح رہے کہ صہیونی مظالم سے فقط بین الاقوامی اسلامی وانسانی اصولوں کی

ہی نہیں بلکہ انسانی حقوق کے سلسلے میں ۱۹۴۹ میں ہونے والے جنیوا کنونشن کی بھی خلاف ورزی ہوتی ہے۔

۲۔ جملہ اسلامی ملکوں کی طرف سے اسرائیل کی مکمل تحریم

۳۔ تسلط و سرکوبی کے خلاف جائز جدوجہد کی حیثیت سے انتفاضہ فلسطین کی بھرپور حمایت کی کوشش۔

۴۔ مقبوضہ فلسطین میں جنگی جرائم کے خلاف عدالتی چارہ جوئی کے لئے اقوام متحدہ کی جانب سے ایک عدالت گاہ کی تشکیل کی کوشش۔

۵۔ مقبوضہ فلسطین میں رونما ہونے والے انسانیت سوز حوادث کے تجزیہ کے لئے ایک غیر جانبدار تحقیقاتی کمیشن کی تشکیل کے لئے مسلمان ملکوں کی مشترکہ سفارتی جدوجہد۔

۶۔ فلسطینی عوام کی اقتصادی ناکہ بندی کی روک تھام۔

۷۔ بیت المقدس کو دار الحکومت قرار دیتے ہوئے ایک فلسطینی حکومت کی تاسیس کی حمایت تاکہ سرزمین فلسطین پر فلسطینی عوام کی حکومت کی تعمیل کی زمین ہموار ہوسکے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس راہ میں اٹھایا گیا ہر قدم دنیا میں صلح و آزادی وعدالت کی تشکیل اور عظیم الشان فلسطینی عوام کی کی خوشحالی کی راہ میں ایک اہم قدم ہے بارگاہ عالیہ خداوندی میں دست بدعا ہوں کہ وہ اس راہ میں آپ سبھی لوگوں کی توفیقات میں اضافہ فرمائے۔

☆☆☆

تہران میں منعقد عالمی حمایت فلسطین کانفرنس سے

آیت اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای کا خطاب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ الذی من علینا بهدایة الاسلام وشرع لنا الجهاد الذی هو باب من ابواب الجنه فتحه الله لخاصة اولیائه و سبحان الذی اسریٰ بعبده لیلا من المسجد الحرام الی المسجد الاقصی الذی بارکنا حوله لنریه من آیتنا انه هو السمیع البصیر والصلوة والسلام علی نبیه البشیر النذیر محمد واله الطیبین الطاهرین وصحبه المنتجبین والسلام علیکم رحمة الله وبرکاته۔

اسلامی ممالک کی مجالس کے محترم رؤسا و نمائندگان حضرات، اسلامی دفاعی تنظیم سے وابستہ نامور مجاہدین اور جملہ مہمان حضرات و حاضرین گرامی قدر!

میں آپ سبھی لوگوں کا پر خلوص استقبال کرتا ہوں اور اپنے نیز آپ سبھی لوگوں کے لئے رحمت و ہدایت الٰہی کا خواستگار ہوں۔

ایسے اجلاس کی تشکیل کا فیصلہ ایک مبارک کام ہے اور انشاء اللہ ملت اسلامیہ فلسطین کے انقلاب کی حمایت کے لئے اسلامی معاشروں کو آمادہ کرنے میں یہ اجتماعات مثبت اور تعمیری اثرات کے حامل ہوں گے۔ اس قسم کے اجتماعات سے عملی طور پر یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ فلسطین ایک ایسا اسلامی مسئلہ ہے جس کا پوری دنیائے اسلام سے گہرا تعلق ہے اور اس پر غاصبانہ قبضہ سابقہ برطانوی اور موجودہ امریکی بین الاقوامی شیطانی سازشوں کی ایک اہم کڑی ہے جس کا بنیادی مقصد دنیائے اسلام میں تفرقہ ڈال کر ملت اسلامیہ کو کمزور بنانا ہے۔

اسلام کے دشمنوں کی ہمیشہ سے یہی کوشش رہی ہے کہ قومی گروہ بندی کے ذریعہ وہ مسلمانوں کے درمیان اتحاد اور وحدت کلمہ کی تشکیل نہ ہونے دیں تاکہ عالم اسلام پر ان کا غلبہ اور دباؤ قائم رہے۔ فلسطین پر اس غاصبانہ قبضہ کی ابتداء میں شیخ عزالدین قسام اور الحاج امین الحسینی جیسے مجاہد علماء نے فلسطین کی آزادی و نجات کے لئے مسلمانوں سے نصرت کا مطالبہ کیا تھا اور اس دور کے مرجع عالیقدر مرحوم محمد حسین آل کاشف الغطاء نے غاصب صہیونی حملہ آوروں کے خلاف حکم جہاد بھی جاری کیا تھا لیکن افسوس کی بات ہے کہ آہستہ آہستہ اس جدوجہد کا سلامی رنگ وروپ پھیکا پڑتا گیا اور فلسطینی تحریک دیکھتے ہی دیکھتے ایک اسلامی مذہبی جدوجہد کے بجائے ایک قومی تحریک میں تحلیل ہو گئی۔

امام خمینی کی قیادت میں انقلاب اسلامی ایران کی عظیم الشان کامیابی نے پوری دنیا بالخصوص اس علاقے کے ملکوں میں اسلامی بیداری کو پھیلانے میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ اس کے علاوہ جنوبی لبنان میں کئی گنا طاقتور اسلام دشمنوں کے مقابلے میں مسلمان مجاہدوں کی کامیابی نے اسلامی جدوجہد کی حقانیت وحقیقت کو دوبارہ ثابت کرتے ہوئے یہ

واضح کر دیا کہ اگر مسلمان وعدۂ خداوندی پر اعتماد کرتے ہوئے فقط رضائی خداوندی کے لئے جدو جہد کریں تو ان کی کامیابی حتمی و یقینی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جنوبی لبنان میں ایک طرف مسلمان مجاہدین کی حیرت انگیز کامیابی اور دوسری طرف دشمنوں کی ذلت آمیز سازشوں کی ناکامی اس پورے علاقے کے لئے نہایت عبرت ناک حادثہ ہے جس نے مظلوم فلسطینی مجاہدوں کو تنظیم انتفاضہ کی طرف دوبارہ متوجہ کر دیا لیکن اس بار صورتحال بالکل مختلف ہے۔ اب صابر و شجاع فلسطینی مجاہدوں پر فلسطینی علاقے میں صلح و سمجھوتہ جیسے فریب کارانہ نغموں کا کوئی اثر نہیں ہے اور ان کی مسلسل مجاہدانہ سرگرمیوں سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ انشاء اللہ فلسطینی مظلوم اپنی انقلابی اور مجاہدانہ سرگرمیوں کو آخری کامیابی تک جاری رکھیں گے کیونکہ اب فلسطینی عوام انتفاضہ اول کی وجہ سے صہیونی عناصر اور ان کے حامیوں کے اس فریب میں آنے والے نہیں ہیں کہ فلسطینی عوام کے مطالبات کو صلح آمیز ڈھنگ سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ اب فلسطینی مظلوموں پر امریکہ یا مغرب یا مغرب زدہ حکام کے فریب کارانہ دباؤ کا بھی سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔ گذشتہ دس سال کی تاریخ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اسرائیلی حکومت کی نجات کے لئے صہیونیت کے طرفداروں نے جو کوششیں کی تھیں وہ سب ناکام ہو گئیں اور اس ظالم حکومت پر مسلمانوں کی جدو جہد کا دباؤ باقی ہے اور دوسری طرف یہ حقیقت بھی پوری طرح واضح ہو گئی کہ ان اسلام دشمن طاقتوں نے مذاکرہ و گفتگو کی حمایت کرنے والے فلسطینی مسلمانوں سے جو وعدہ کیا تھا وہ محض ایک سراب ہے۔

درحقیقت آج اسرائیل جس وسعت پسندی، غاصبانہ تسلط اور وحشیانہ مظالم پر مبنی راہ وروش کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ اسلامی معاشروں سے ہمدردی رکھنے والے اہل بصیرت

افراد کو اس کا بخوبی اندازہ تھا کیونکہ یہ اسرائیلی فطرت میں شامل ہے۔

اسرائیل کے وجود کی ابتداء سے یہ غاصب اور جعلی حکومت ہمیشہ فلسطینی مسلمانوں کے حقوق کے سلسلے میں ظلم و تجاوز اور فریب و خیانت سے کام لیتی چلی آ رہی ہے اور بعض مغربی حکومتیں بالخصوص حکومت امریکہ جملہ اسرائیلی کرتوتوں کو جائز ثابت کرنے میں سرگرم رہی ہے۔ بین الاقوامی تنظیموں اور عالمی اداروں نے بھی امریکی دباؤ کی وجہ سے اسرائیلی حکومت کے اقدام کو جائز قرار دینے کی کوشش کی ہے تاکہ اس کی ظالمانہ شناخت اور اس کی حملہ آورانہ ماہیت کو جائز و مشروع قرار دیا جاسکے۔

واضح رہے کہ سرزمین فلسطین اور بیت المقدس ہمیشہ ہی بعض مغربی طاقتوں کی لالچ کا نشانہ رہا ہے چنانچہ مسلمانوں پر طویل المدت صلیبی جنگوں کی تحمیل کا بنیادی راز یہی رہا ہے کہ ان طاقتوں نے اس مقدس سرزمین پر اپنی لالچ بھری نگاہیں جمار کھی تھیں۔ سلطنت عثمانیہ کی شکست کے موقع پر اتحادی افواج کے بعض سپہ سالاروں نے شہر بیت المقدس میں داخل ہونے کے بعد یہ کہا تھا "آج سے صلیبی جنگوں کا خاتمہ ہو گیا۔"

درحقیقت اس سرزمین کو ایک ہمہ جہتی اور پیچیدہ منصوبے کی بنیاد پر غصب کیا گیا تھا جس کا مقصد مسلمانوں کے درمیان وحدت واتحاد کی روک تھام اور دوبارہ طاقتور اسلامی حکومتوں کی تشکیل میں رکاوٹ پیدا کرنا تھا۔ ایسے بے شمار دلائل و شواہد موجود ہیں جن کی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ جرمنی کے نازیوں اور صہیونی جلادوں کے درمیان نزدیکی تعلقات موجود تھے۔ یہ دونوں کی ملی بھگت کا نتیجہ تھا کہ یہودی مقتولین کی اتنی بڑی اور ناقابل یقین تعداد کا اعلان کیا گیا تاکہ عالمی رائے عامہ کو یہودیوں کے حق میں ہموار کر لیا جائے اور اس طرح فلسطین پر غاصبانہ تسلط کی زمین ہموار ہو جائے اور مستقبل قریب میں

صہیونی جلادوں کے مظالم کی توجیہہ بھی ہو جائے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ایسے دلائل بھی موجود ہیں جن کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ مشرقی یورپ کے کچھ غیر یہودی غنڈوں اور اوباش لوگوں کو یہودی بنا کر فلسطین بھیج دیا گیا تاکہ نسل پرستی کی راہ میں قتل ہونے والے لوگوں کے پسماندگان کی حیثیت سے انہیں بھرپور عالمی حمایت حاصل ہو جائے اور اس حمایت کی آڑ میں دنیائے اسلام کے قلب میں ایک طاقتور اسلام دشمن حکومت کا قیام عمل میں آجائے اور اس طرح چودہ سو برس بعد اسلام دشمن طاقتوں کے ذریعہ مغربی اور مشرقی مسلمانوں کے درمیان ایک علیحدگی قائم ہو جائے۔ ابتدائی مرحلہ میں مسلمانوں پر عجیب غفلت طاری ہو گئی کیونکہ وہ صہیونیوں اور ان کے طرفداروں کے چھل کپٹ سے ناواقف تھے۔ عثمانی ہار گئے اور خفیہ طور پر فاتح طاقتوں کے درمیان مشرق وسطی کے اسلامی ملکوں کی تقسیم کی غرض سے پیکو سائکس نامی معاہدہ منعقد ہو گیا۔ عالمی برادری نے فلسطین کی قومیت کا مسئلہ برطانوی حکومت کے سپرد کر دیا اور ان لوگوں نے بھی صہیونیت کی بھرپور حمایت کا وعدہ کر لیا اور سوچے سمجھے منصوبوں کے مجموعے کے تحت برطانوی حکمراں یہودیوں کو فلسطین لے آئے اور اس سرزمین کے حقیقی مسلمان باشندوں کو آوارہ وطن کر دیا۔ اس طولانی مقابلہ و صف آرائی میں ایک طرف مغرب اور صہیونیت اور دوسری طرف نو تشکیل شدہ عرب حکومتیں۔ اسلام کے دشمنوں نے اس مقابلے کے دوران مختلف النوع پیچیدہ حربوں ہتھکنڈوں کا بھرپور استعمال کیا جس میں عالمی اداروں اور تبلیغاتی تنظیموں کی کارکردگی قابل ذکر تھی۔ ایک طرف تو یہ لوگ مسلمانوں کو صلح و سلامتی اور صبر و تحمل کی دعوت دے رہے تھے اور دوسری طرف اسرائیل کو جدید ترین اسلحوں سے مسلح کرتے جا رہے تھے۔ اسرائیل اور مسلمان ملکوں کے درمیان اس نامساوی

اور امتیاز آمیز روش کا بنیادی مقصد اسلامی ملکوں پر اسرائیل کی فوجی بالادستی کو ہمیشہ محفوظ رکھنا اور بین الاقوامی سطح پر اسرائیلی حکومت کی حمایت کرنا اور اپنے تبلیغاتی وسائل کے ذریعہ اسرائیلی مظالم کی توجیہ کرنا تھا۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ یہ مغربی طاقتیں مسلمانوں کے درمیان یہ پروپگنڈہ بھی کیا کرتی تھیں کہ اسرائیل اتنا طاقتور ہو گیا ہے کہ اس پر غلبہ وکامیابی کا خیال محض خام خیالی ہے۔

تقریباً نصف صدی سے بھی کچھ عرصہ قبل اقوام متحدہ کی طرف سے سرکاری شناخت حاصل کرنے کے بعد سے لے کر پچھلے سال تک اسرائیل ہر اعتبار سے اپنی من مانی کیا کرتا تھا اور پوری دنیا میں اس کی روک تھام کرنے والا کوئی نہ تھا لیکن ایمانی اسلحوں سے مسلح لبنان کے کچھ ہزار جانباز نوجوانوں نے اپنی اسلامی جدوجہد کے ذریعہ نہ صرف حکومت اسرائیل بلکہ اس کے طرفداروں کی بھی نیند حرام کردی۔ ان بہادر مسلمان نوجوانوں نے کسی چیز کی پرواہ کئے بغیر انتہائی ذلت ورسوائی کے ساتھ اسرائیل کو جنوبی لبنان سے باہر نکال دیا اور ان کی یہ عظیم الشان کامیابی دوسرے مسلمان مجاہدین کے لئے مشعل راہ بن گئی اور آج مسجد الاقصیٰ میں انتفاضہ کی مجاہدانہ سرگرمیوں کا منظر ہماری نگاہوں کے سامنے ہے جو لبنان کی اسلامی جدوجہد سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔

اب آپ حضرات ایک اسلامی فریضہ کی حیثیت سے انتفاضہ کی حمایت کے لئے ایک جگہ پر جمع ہوئے ہیں اور یقیناً یہ آپ لوگوں کی بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ سب سے پہلے آپ لوگوں کو یہ ثابت کرنا چاہئے کہ ملت اسلامیہ اسلامی بیداری کے سایہ میں اسلامی تاریخ کی عظیم الشان روایتوں کی طرف واپسی کے لئے پوری طرح متعہد ہے اور مسلمانوں کے درمیان وحدت واتحاد ان عظیم الشان روایتوں میں سرفہرست ہے جس نے ماضی میں

صلیبی جنگ کے دوران حملہ آوروں کو شرمناک شکست سے دوچار کردیا تھا۔ اس عظیم تاریخی واقعہ میں کفروایمان کے درمیان ہونے والی اس فیصلہ کن نبرد آزمائی میں شرکت کیلئے پوری اسلامی دنیا سے مجاہدوں کی ٹولیاں میدان جنگ کی طرف روانہ ہوگئی تھیں۔

آج دنیا کے تمام مسلمانوں نے فلسطینی عوام کی اس فیصلہ کن جدوجہد پر اپنی نگاہیں جمار کھی ہیں اور ان لوگوں کو انتفاضہ اول سے بھی زیادہ بڑی کامیابی کی امید ہے کیونکہ اس زمانے میں یعنی دس سال قبل موافقت و سمجھوتہ کا ماحول آہستہ آہستہ پورے علاقے پر غالب آچکا تھا۔ بعض لوگوں نے اپنادل امریکہ کے ہاتھوں گروی رکھ دیا تھا اور بعض دیگر افراد کا یہ خیال تھا کہ بین الاقوامی ماحول سازی اور غیر معمولی عالمی سیاسی دباؤ کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا ہے اور موجودہ صورتحال میں اب اس کے علاوہ کوئی دوسرا چارہ کار نہیں رہ گیا کہ امریکہ اور اسرائیل کی شرطوں پر مجوزہ سمجھوتہ کو تسلیم کرلیا جائے۔ اس وقت علاقے میں جو حالات رونما ہوئے ان سے بھی اس نظریہ کو کافی قوت حاصل ہوئی۔ لیکن اس سال ایسے حالات میں یہ کانفرنس منعقد ہوئی ہے کہ علاقے میں صلح و مصالحت پر مبنی راہ حل میں غیر معمولی رکاوٹ پیدا ہوگئی ہے اور سر دست ان لوگوں کو بھی اس رکاوٹ کا اعتراف ہے جن لوگوں نے اپنادل امریکہ کے ہاتھوں گروی رکھدیا تھا۔

۱۹۹۱ء میں جنگ خلیج فارس کے دوران عربوں اور مسلمانوں کی لگاتار شکست کی وجہ سے ان لوگوں پر عجیب بوکھلاہٹ سی طاری ہوگئی تھی اور ان لوگوں کی اندرونی وحدت کا شیرازہ بھی عنقریب منتشر ہونے والا تھا اور ان لوگوں پر اختلاف چھایا ہوا تھا۔ لیکن موجودہ حالات اور بالخصوص جنوبی لبنان میں اسلامی جدوجہد کی عظیم اور تاریخی کامیابی کے سایہ میں مسلمانوں کے دل میں کامیابی کی نئی اور حیات بخش امیدیں پیدا ہوگئی ہیں۔

اس زمانے میں اسرائیل سے مقابلہ کرنے کے لئے ہمیشہ دو طرح کی تجویز سامنے رکھی جاتی تھیں۔ جب اسرائیل کے خلاف عربوں کے فوجی مقابلے کی بات آتی تھی تو یہ کہا جاتا تھا کہ اس سلسلے میں اب تک جو بھی تجربے کئے گئے ان میں صرف شکست اور ناکامی ہی حاصل ہوئی ہے۔ دوسری تجویز صلح اور سمجھوتہ پر مبنی تھی جس کے ذریعہ امن و سلامتی کے ساتھ اسرائیلی اغراض و مقاصد کی تکمیل ہو رہی تھی۔ اسرائیل مقبوضہ فلسطینی سرزمین کے مختصر سے علاقے سے اپنی فوجوں کی واپسی اور عقب نشینی کے ذریعہ اس بات کی باقاعدہ ضمانت حاصل کرلیا کرتا تھا کہ اب فلسطینی فوج اپنی طاقت کو مضبوط بنانے یا اس میں کسی قسم کا اضافہ کرنے کی کوشش بھی نہ کرے گی جس کی جیتی جاگتی مثال ہم کیمپ ڈیوڈ معاہدہ کے موقع پر اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں۔ اس زمانے میں ہم لوگوں کے پاس دشمن سے مقابلے کا کوئی نمونہ موجود نہ تھا اور مقابلے کا جو طریقہ سامنے آتا تھا اسے یہ کہہ کر ٹال دیا جاتا تھا کہ اسے قبولیت حاصل نہیں ہے۔ لیکن اب تو ہم لوگوں کے سامنے ایک کامیاب نمونہ موجود ہے کہ پہلی بار اسرائیل کو کسی قسم کی کوئی چھوٹ دیئے بغیر مسلمان مجاہدین اپنے مقبوضہ اسلامی علاقوں کو آزاد کرانے میں کامیاب ہوگئے اور غاصب اسرائیلی حکومت کے ارمانات کی تکمیل کے بجائے لبنانی مسلمان مجاہدین کے دار الحکومت میں اسلامی پرچم لہرانے میں پوری طرح کامیاب ہوگئے۔ معاہدہ کیمپ ڈیوڈ میں اسرائیلی فوج کی عقب نشینی کی بنیادی شرط یہ تھی کہ مصر اپنی فوجوں کو سینا کے شمالی علاقے کی طرف نہ روانہ کرے گا لیکن جنوبی لبنان میں یہ اسرائیل ہے جو اسلامی مجاہدین سے بڑے التماس کے ساتھ یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ لبنانی فوج کو فلسطین اور لبنان کی سرحدوں کی طرف روانہ کردے یعنی لبنان کے اسلامی مجاہدوں نے اقتدار و حکومت کو جنوبی لبنان اور دیگر مقبوضہ

علاقوں کے ہاتھوں میں پھر سے پہونچادیا۔

یہ تنظیم انتفاضہ در حقیقت ایک عوامی انقلاب ہے جن سے وابستہ لوگ ہر طرح کی صلح و سمجھوتے والی راہ وروش سے پوری طرح ناامید ہو چکے ہیں۔ یہ لوگ اچھی طرح سمجھ چکے ہیں کہ کامیابی تو بس ان لوگوں کی ذاتی اور عملی جدو جہد کے ذریعہ ہی حاصل ہو سکے گی۔ فلسطینی عوام کو اپنے سابقہ انتفاضہ کے دوران غیر معمولی نقصان اٹھانا پڑا تھا اور ان لوگوں نے راہ اسلام اور ملت اسلامیہ سے وابستہ سرزمین کی آزادی کی راہ میں عظیم جانی اور مالی قربانیاں پیش کی ہیں لیکن آخر کار ''مذاکرۂ اسلو'' کی کہ وجہ سے ان لوگوں کو اپنی اپنی انقلابی سرگرمیوں کو روکنا پڑا۔ اسلو کا کیا نتیجہ نکلا؟ آج اس مذاکرۂ اسلو کی طرفداری کرنے والے فلسطینی مسلمان بھی اس پروگرام کی حمایت کے لئے آمادہ نہیں ہیں کیونکہ بعد میں انہیں اس حقیقت کا اندازہ ہو گیا کہ اس پروگرام کے ذریعہ اسرائیل اپنی پریشانی دور کرنا چاہتا تھا۔ اور اسرائیلی فوج میں اتنی طاقت باقی نہ رہ گئی تھی کہ وہ ہاتھ میں پتھر لئے ہوئے فلسطین مجاہدوں کا مقابلہ کر سکے۔ اسرائیل کو اس اسلامی جدو جہد کے دوران بھاری نقصانات اٹھانے پڑے تھے لہٰذا وہ اس قسم کے مصالحتی ہتھکنڈوں کے ذریعہ اپنے خسارہ کی مقدار کم کرنا چاہتا تھا۔ اس مذاکرہ کے نتیجے میں فلسطینی مجاہدوں کو کسی قسم کی کوئی رعایت نہیں دی گئی اور اگر معمولی سی چھوٹ یا رعایت دی بھی گئی تو اس کا مقصد در حقیقت انتفاضہ کی آگ کو ٹھنڈا کرنا اور اپنے جانی و مالی نقصانات کو کم کرنا تھا۔ اپنی پریشانیوں کو دور کرنے کے چکر میں اسرائیل نے یہ غلط اندازہ کر لیا تھا کہ اب فلسطینی مجاہدوں میں انتفاضہ سرگرمیوں کو جاری رکھنے کی طاقت نہیں رہ گئی ہے لہٰذا انہیں معمولی سی رعایت دیکر جنگ کی آگ کو وقتی طور پر ٹھنڈا کیا جاسکتا ہے۔ ان خیالات کے ذریعہ

اسرائیل بلاوجہ ڈینگ مار رہاہے ورنہ ایسا کچھ نہیں تھا۔ بہر حال "مذاکرۂ اسلو" نے فلسطینی عوام پر بالکل واضح کر دیا کہ صلح ومصالحت وغیرہ محض ایک دھوکا ہے اور قیام وانقلاب کے علاوہ ان کی نجات کا کوئی دوسراراستہ نہیں ہے۔

انتفاضہ کا اصلی محور ومرکز مسجد اقصیٰ یعنی بیت المقدس ہے۔ یہ وہ چنگاری ہے جس نے فلسطینی عوام کے جذبات کو آگ کے شعلوں میں تبدیلی کر دیا۔ صہیونیوں نے مسجد الاقصیٰ کو اپنے محاصرہ میں لے رکھا تھا اور اس کے احترام کیلئے زبردست خطرہ لاحق ہو چکا تھا اور مسلمانوں کے ایک مقدس ترین مکان کی حفاظت کی ذمہ داری فلسطینی عوام کے کندھوں پر تھی لہٰذا وہ میدان عمل میں کود پڑے اور اپنی قربانی وفداکاری کے ذریعہ ظالم وغاصب صہیونی جلادوں کے خلاف مسلسل جدوجہد ونبرد آزمائی کی آگ بھڑکا دی۔

مصالحت وسمجھوتے کی راہ وروش بلکہ واضح لفظوں میں "منصوبہ اسلو" درحقیقت فلسطینی مسلمانوں کے درمیان تفرقہ واختلاف کا سبب بن گیا لیکن یہ "مقدس انتفاضہ" کا کرشمہ تھا کہ اس نے فلسطینی عوام کے درمیان دوبارہ قومی اتحاد قائم کر دیا اور آج فلسطینیوں کی مقدس اسلامی جدوجہد اور انقلابی سرگرمیوں میں ہر طبقے کے لوگ عملی طور پر شریک ہیں اور اسلامی وملی واقعات میں ایک دوسرے کا ساتھ دے رہے ہیں یہاں تک کہ ان میں وہ افراد بھی شامل ہیں جن کا دل تو دوسری جگہ گروی ہے لیکن موجودہ انقلابی اور مجاہدانہ سرگرمیوں میں شریک ہیں۔

اسلامی جدوجہد یا دوسری عبارت میں "اسلامی بیداری کی تحریک" درحقیقت انقلاب اسلامی ایران کی عظیم الشان کامیابی کے بعد اور تقریباً ایک دہائی تک امام خمینیؒ کی عملی اور باشعور قیادت کے سایہ میں صرف علاقائی سطح پر رونما نہیں ہوئی ہے بلکہ پوری

اسلامی دنیا میں اس کی موجودگی ظاہر ہو چکی ہے اور آج اس تحریک کا محور و مرکز مسئلہ فلسطین ہے۔"انتفاضہ مسجد الاقصیٰ"،فلسطین کی جغرافیائی سرحدوں کے باہر کے لوگوں اور فلسطینی قوم کے علاوہ دیگر عرب اور مسلمان قوموں کو بھی میدان عمل میں لا کر کھڑا کر دیا۔ مغرب سے مشرق تک پوری دنیائے اسلام میں فلسطین اور بیت المقدس کی حمایت میں منعقد لاکھوں افراد پر مشتمل مظاہروں نے یہ واضح کر دیا کہ فلسطینی عوام ان کی حمایت پر بھروسہ کر سکتے ہیں اور یہ مظلوم عوام پوری اسلامی دنیا کو وحدت و اتحاد سے مالامال کرنے میں نمایاں کردار ادا کر سکتے ہیں۔

جس دن لبنان میں لبنانی مجاہدوں کی شجاعت اور امام خمینیؒ کی حمایت کے ساتھ "اسلامی مورچہ" کی تشکیل عمل میں آئی تھی اس وقت لبنان کا دارالحکومت بیروت اسرائیلی غاصبوں کے قبضے میں تھا اور اس ملک کا سیاسی مقدر اسرائیلی جلادوں کے چنگل میں تھا۔ جب اسلامی مورچہ میں شامل لبنانی جانبازوں نے " زحفاز حفا نحو القدس "کا نعرہ بلند کیا تو بعض ناواقف افراد نے انہیں سادہ لوح کہکر نظر انداز کر دیا اور طعنہ آمیز انداز میں ان لوگوں سے دریافت کرنے لگے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ تم لبنانی لوگ جو اپنے ملک کے دارالحکومت میں تو داخل نہیں ہو سکتے ، بیت المقدس پہونچ کر اسے آزاد کروالو؟اس تاریخ سے حساب لگایا جائے تو اسرائیل پر لبنانی اسلامی مورچہ کی کامیابی میں ۱۸ سال کا وقت لگ گیا۔اب آپ خود ہی تصدیق فرمایئے کہ اقوام کی جدو جہد کی تاریخ میں ۱۸ سال کی مدت زیادہ نہیں ہوا کرتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ انقلابی جدو جہد افسوسناک نقصانات کی حامل ہوا کرتی ہے۔لوگ قتل ہوتے ہیں، گھر ویران کرنے والے ہوتے ہیں۔لوگوں کو بھاری اقتصادی

بوجھ اٹھانا پڑتا ہے اور اس قسم کے مختلف النوع مصائب سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور ان میں بعض ایسے مصائب و آلام ہوا کرتے ہیں جن کا غم ہمارے دلوں سے کبھی نہ مٹے گا۔ لیکن ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ ان عظیم قربانیوں کا نتیجہ کیا ہوا؟ در حقیقت اس جدوجہد کے نتیجے میں گرانقدر کامیابی حاصل ہوئی ہے اور اس کامیابی کی قیمت بہر حال ادا کرنی ہے۔

کل تک اسرائیل اس علاقے میں لمبی لمبی ڈینگیں مارا کرتا تھا اور ایک تاناشاہ کی طرح عرب قوموں پر اپنا حکم چلایا کرتا تھا لیکن آج اس نے نہایت ناتوانی اور افسردگی کی حالت میں اسلامی مورچہ کی جدوجہد کے سامنے گھٹنے ٹیک دئے ہیں۔ یہ عرب اور مسلمان قوموں کی طاقت کی ہلکی سی جھلک ہے اور یقین جانئے کہ اگر ملت اسلامیہ عالم اپنے جملہ وسائل و امکانات کا قدرے بیشتر حصہ اس راہ میں لگادے تو ہم لوگ اسرائیل کی نابودی کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ جنوبی لبنان کے علاقے چند ہزار افراد پر مشتمل سپاہیان اسلام کے مقابلے میں اسرائیل کو شرمناک شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ درست ہے کہ حزب اللہ گہری اور عوامی وسعت کی حامل ہے اور بوقت ضرورت اس نے لاکھوں افراد کا لشکر فوری طور پر آمادہ کردیا ہے لیکن جن لوگوں نے لگاتار اسرائیلی جارحیت کے خلاف نبرد آزمائی کی ہے ان کی تعداد چند ہزار افراد اور کبھی کبھی تو چند صد افراد تک ہی محدود رہی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جدید ترین مہلک اسلحوں اور فوجی تکنیکی صلاحیتوں سے مالامال اسرائیلی فوج جس کا امریکی اسلحہ ساز فیکٹریوں سے براہ راست تعلق ہے، معمولی اسلحوں سے مسلح چند صد باالایمان مسلمان فوجیوں کے مقابلے میں شکست کھا گئی۔ البتہ مسلمان سپاہیوں کے پاس ایمان کا اسلحہ تھا جس کا مقابلہ کرنا اسرائیل کے بس کی بات نہیں تھی۔

پس دشمن کے خلاف جدو جہد و نبرد آزمائی کا نمونہ ہماری نگاہوں کے سامنے ہے یعنی جدو جہد اور نبرد آزمائی کے ذریعہ اور جانی ومالی نقصانات کا بوجھ اٹھاتے ہوئے کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے۔اس کے ساتھ ہی ساتھ شکست وناکامی کا نمونہ بھی ہماری نظروں کے سامنے ہے اور مصالحت آمیز راہ وروش سے دل لگانا در حقیقت صلح کا کٹورا لیکر ادھر ادھر بھیک مانگنا ہے جس کا نتیجہ ذلت ورسوائی اور یکطرفہ اسرائیلی مطالبات کی تکمیل ہے اور ہم لوگ یہ تمام چیزیں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں۔

آج حزب اللہ اور اس کی تاریخی کامیابی فلسطینی عوام کے انتفاضہ کے لئے پشتوانہ ہے اور یہ پشتوانہ بہت مضبوط ہے۔

در حقیقت صہیونی حکومت میں اب اتنی طاقت باقی نہیں رہ گئی ہے کہ وہ فلسطینی مجاہدوں کے خلاف لگاتار اور طویل المدت جنگ جاری رکھ سکے۔ حکومت اسرائیل یہودیوں کو دھوکا دیکر فلسطین لائی ہے اور اس کو یہ امید ہے کہ عرب لوگ اسرائیلی حملہ آوروں کے خلاف جنگ و نبرد آزمائی نہ کریں گے اور اگر ان لوگوں نے جنگ کا فیصلہ بھی کر لیا تو مغرب کے دباؤ کی وجہ سے جنگ کی کارروائی لمبی مدت کے لئے روک دی جائے گی۔ پس جو لوگ اسرائیلی مکر و فریب کی وجہ سے فلسطین آبھی گئے ہیں وہ اس بات کے لئے ہرگز آمادہ نہیں ہیں کہ وہ صہیونیت کے ٹھیکیداروں کے سیاسی مقاصد کے لئے اپنی جان نچھاور کر دیں۔ موصولہ اطلاعات کے بموجب اس مدت کے دوران صہیونیوں کا سیاسی پروگرام غیر معمولی طور پر متاثر ہوا ہے اور سیاحتی اداروں کو زبردست مالی نقصانات جھیلنے پڑے ہیں اور پانسہ اس حد تک پلٹ چکا ہے کہ جن یہودیوں کو یہاں لا کر آباد کیا گیا تھا وہ دوبارہ مہاجرت کے لئے مجبور ہو گئے ہیں۔

اس سلسلے میں تہران میں منعقد ہونے والی گذشتہ کانفرنس نے بنیادی و مثبت کام انجام دیا ہے کیونکہ اس اجتماع نے ان لوگوں میں امید کی شمع روشن کردی جو مصالحانہ اور مفاہمت آمیز راہ وروش کے مخالف تھے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اس نے فلسطینی عوام میں امید کی نئی روح پھونک دی اور ان کے حوصلوں میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا۔ اسلامی جمہوریۂ ایران نے اس سلسلے میں جو موقف اختیار کئے تھے وہ اس زمانے کی اسلامی حکومتوں کے مابین انفرادی نوعیت کے حامل تھے لیکن ان مواقف پر ایران کی ثابت قدمی نے بھی فلسطینی عوام کے حوصلے بلند کردئے۔ آج پھر فلسطینی عوام کو تمام چیزوں سے کہیں زیادہ دنیائے اسلام کی معنوی حمایت درکار ہے کیونکہ یہ لوگ اسلامی موقف پر ثابت قدمی کے خواہاں ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انہیں مالی امداد کی بھی ضرورت ہے اور اس سلسلے میں بھی فوری اور سنجیدہ اقدام کی ضرورت ہے لیکن وہ لوگ مختلف ملاقاتوں کے درمیان اس بات کا بڑی وضاحت کے ساتھ اعلان کرچکے ہیں کہ "ہم لوگوں کو دوسری چیزوں سے کہیں زیادہ مستحکم عرب۔اسلامی موقف کی ضرورت ہے۔"

آپ لوگوں کی موجودہ کانفرنس کو چاہئے کہ وہ اس سلسلے میں کوئی عملی قدم اٹھائے تاکہ ملت اسلامیہ عالم کی ہر ممکن اور غیر معمولی حمایتوں کے ذریعہ فلسطینی عوام کی خوشحالی کا سامان فراہم ہوجائے۔ مختلف اسلامی ممالک کے آپ سبھی نمائندے اس سلسلے میں لازمی کوشش اور اپنی ملت کے وسائل کو نگاہ میں رکھتے ہوئے انہیں آزادی فلسطین کی راہ میں میں بروئے کالا سکتے ہیں۔

فلسطین کی مظلوم قوم اور ان کے مظلومانہ وشجاعانہ انقلاب کی بھر پور حمایت ہم سبھی مسلمانوں کا اسلامی فریضہ ہے۔ آج ایک مسلمان قوم خون آلود چہرہ کے ساتھ میدان جنگ سے ملت اسلامیہ عالم کی طرف امید بھری نگاہوں سے دیکھ رہی ہے اور انہیں اپنی مدد کے لئے پکار رہی ہے۔ میں اخباری نمائندہ کے کیمرہ کے سامنے بلکتی ہوئی اس فلسطین خاتون کی آواز کو کبھی نہیں بھول سکتا جو درد آمیز لہجے میں یہ نعرہ لگا رہی تھی۔"یا لِلمسلمین .."

تمام عربوں اور مسلمانوں کو جائز اور حق وانصاف پر مبنی فلسطینی عوام کی جدو جہد کی حمایت کرنی چاہئے اور عالمی اداروں و بین الاقوامی تنظیموں میں اس بات پر تاکید کرنی چاہئے کہ وہ بے دفاع عوام جن کے بنیادی حقوق سلب کر لئے گئے ہوں اور ظالمانہ گھٹن کے ماحول میں سانس لے رہے ہوں، انہیں اپنے حق کو حاصل کرنے کے لئے ہر ممکن جدو جہد کا پورا حق حاصل ہے پس انتفاضہ کی لگاتار کارروائی اور فلسطینی عوام کی منصفانہ جدو جہد ان لوگوں کا جائز حق ہے اور بین الاقوامی قوانین نے بھی اس حق کو جائز اور محترم شمار کیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ عام طور پر ان قوانین کی تفسیریں بیان کرتے وقت دنیا کی عظیم اور سامراجی طاقتوں کے مطالبات کو نگاہ میں رکھا جاتا ہے۔

حضرات! مطمئن رہیے کہ اسرائیلی حکومت اندر سے بالکل سڑ چکی ہے اور موجودہ صہیونی نسل کسی قیمت پر بھی اسکی حفاظت کے لئے کوئی قربانی دینے کے لئے قطعی آمادہ

نہیں ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ آج کی عرب اور مسلمان قومیں، گذشتہ پچاس برسوں کے مقابلے میں، زیادہ مستحکم و طاقتور ہیں اور مختلف شعبوں میں ان کی طاقت میں بڑا اضافہ ہوا ہے۔ مسلمان ان روزانہ فلسطینی قوم کی سر کوبی کو خاموش تماشائی کی طرح نہیں دیکھ سکتے ہیں۔ اسرائیل کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ ملت اسلامیہ فلسطین کی لگاتار سر کوبی اور فلسطینی نشین علاقوں کی پامالی و نابودی کے خلاف اسے عربوں اور مسلمانوں کے شدید، فوری اور عملی رد عمل کا سامنا کرنا پڑے گا۔

فلسطینی عوام کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہئے کہ وہ اپنی دلیرانہ جدو جہد کو جاری رکھیں۔ انہیں اس حقیقت کا بخوبی اندازہ ہے کہ لبنان میں اسرائیل کی سر کوب گرانہ راہ وروش کی روک تھام میں جو چیز سب سے زیادہ موثر اور کا آمد ثابت ہوئی تھی وہ لبنانی عوام کی بھر پور اور مستحکم اسلامی جدو جہد تھی جس کے دوران ان لوگوں نے اسرائیل کو بھاری نقصانات سے دوچار کر دیا تھا اور اس میں کسی مفاہمت آمیز یا بیچ بچاؤ والی راہ ورش کا قطعی کوئی اثر نہیں تھا بلکہ اسلامی جدو جہد سے وابستہ سر فروش مجاہدوں نے اپنی جان ہتھیلی پر لیکر اسرائیلی حملہ آوروں پر ایسا دھاوا بول دیا کہ ان کے پاس فرار کے علاوہ کوئی دوسرا چارۂ کار نہ رہ گیا۔

فلسطینی عوام کے درمیان موجود اندرونی وحدت اور دیگر فلسطینی حوادث کو ایک بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ ہر وہ چیز جو حقیقی راہ وروش سے انحراف کا باعث ہو یا حقیقی دشمن کی طرف سے منحرف بناتی ہو وہ کسی اعتبار سے فلسطینی مقاصد کی تکمیل میں معاون نہ ہو گی۔ خدا کا شکر ہے کہ گذشتہ پچاس برسوں کے دوران فلسطینی عوام اس امتحان میں

پوری طرح کامیاب رہے ہیں اور ساری دنیا پر واضح کر دیا ہے کہ وہ اس سلسلے میں راسخ عقیدہ کے حامل ہیں۔ ہم لوگوں نے دیکھا کہ اسرائیل در حقیقت فلسطینی مجاہدین کے درمیان اختلافات کو ہوا دینے میں پوری طرح ناکام رہا ہے اور فلسطینی مجاہدین کی انقلابی تحریکیں نظریاتی اختلافات کے باوجود اپنے انقلابی صبر کے ذریعہ دشمن کا مقابلہ کرتی رہیں اور دشمن کی خواہش پوری نہیں ہونے دی۔اب اس کے بعد بھی ایسا ہی ہونا چاہیئے۔

آج یہ بات پوری طرح واضح ہو چکی ہے کہ جو لوگ یہ خیال کیا کرتے تھے کہ مسئلہ فلسطین ایک علاقائی معاملہ ہے اور اس کا دائرہ دنیائے اسلام کے ایک مختصر علاقے تک ہی محدود ہے، وہ محض خام خیالی کا شکار تھے کیونکہ صہیونی اسلحہ خانوں میں محفوظ مہلک، تباہ کن اور اجتماعی قتل عام والے اسلحوں کی غیر معمولی مقدار فقط خالی ہاتھ فلسطینی مجاہدوں سے مقابلے کے لئے نہیں جمع کئے گئے بلکہ ایٹمی اور انسانیت کش اسلحوں کی جمع آوری کا مقصد دنیائے اسلام بالخصوص مشرق وسطیٰ پر اسرائیل کا غلبہ و دبدبہ قائم کرنا ہے۔ ادھر حزب اللہ گروہ مقبوضہ اسلامی علاقوں کی آزادی کی کوشش میں لگا ہوا ہے اور دوسری طرف اس کی تلافی کی خاطر اسرائیل شامی فوج پر مسلسل حملہ آور ہے۔ان چیزوں سے اسرائیل اور اس کے مغربی طرفداروں کی شیطانی نیت کا پتہ چلتا ہے۔ غاصب اسرائیلی حکومت کے خلاف جدوجہد کے لئے درج ذیل طریقہ کار اختیار کرنا چاہیئے۔

الف: غاصب حکومت کو مقبوضہ سرزمین کی سرحدوں کے اندر ہی محدود کر دینا چاہیئے۔اس کے اردگرد اقتصادی اور سیاسی ماحول کا دائرہ اتنا تنگ کر دینا چاہیئے کہ وہ آسانی سے سانس نہ لے سکے اور اردگرد کے ماحول سے اس کا کوئی رابطہ باقی نہ رہ جائے۔

ب: سرزمین فلسطین میں فلسطینی عوام کی جدوجہد کو جاری رکھنے کی بھرپور

کوشش کرنی چاہئے اور انہیں جن چیزوں کی ضرورت ہو اسے فراہم کرنے میں ذرہ برابر کوتاہی نہ کرنی چاہئے تاکہ وہ اسرائیلی جارحیت کا منہ توڑ جواب دیتے ہوئے مکمل اور آخری کامیابی حاصل کرلیں۔

برادران و خواہران! آج عالمی سامراج اور اس کا سرغنہ امریکہ اسلامی جمہوریہ ایران پر ہر طرح کا دباؤ ڈال رہا ہے اور اس کا واحد سبب فلسطین کو حاصل ہماری بھرپور حمایت و پشت پناہی ہے۔ امریکی حکمراں نہایت واضح انداز میں اس حقیقت کی نشاندہی کر چکے ہیں کہ امریکہ اور اسلامی جمہوریہ ایران کے درمیان بنیادی جھگڑا ہی یہ ہے کہ اسلامی جمہوریہ ایران فلسطین کے سلسلے میں ذلت آمیز معاہدوں اور منصوبوں کی مخالفت کرتا ہے ورنہ ایران میں انسانی حقوق کی پامالی اور مہلک اسلحوں کی فراوانی وغیرہ تو محض سطحی نوعیت کے حامل ہیں۔ ان کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے بلکہ یہ تو محض بہانہ ہیں۔ اگر ایران لبنانی اور فلسطینی مجاہدوں کی حمایت سے کنارہ کشی اور علیحدگی اختیار کرے تو امریکہ اور اس کے اتحادی ممالک ایران کے خلاف اپنی معاندانہ راہ روش سے دستبردار ہو جائیں گے! البتہ ہم لوگوں کو اس حقیقت کا بخوبی علم ہے کہ ان لوگوں کی بنیادی اور اصلی شکل اسلام اور اسلامی حکومت ہے اور وہ لوگ ایران کی اسلامی جمہوری حکومت کی سیاسی راہ و روش سے بخوبی آشنا ہیں اور ہم ان کی ہر سازشانہ تجویز کی تردید بھی کر چکے ہیں۔ درحقیقت فلسطین اور لبنان کے مظلوم عوام کی حمایت ہمارا اسلامی فریضہ ہے لہٰذا وہ لوگ چاروں طرف سے دباؤ ڈالنے کے بعد بھی ملت اسلامیہ ایران کی مختلف انقلابی جماعتوں کے درمیان اختلاف ڈالنے میں کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ ان لوگوں کی اصلی سیاست متحد ایرانی عوام کو اختلافات کا شکار بنانا ہے اسی وجہ سے ان لوگوں نے ایک جماعت کو اصلاح پسند اور دوسری جماعت کو

محافظہ کار اور بنیاد پرست کا نام دیدیا ہے اور ان میں سے ایک گروہ کی حمایت کرتے ہیں اور دوسری جماعت کے خلاف تبلیغاتی حملہ کررہے ہیں۔

یہ لوگ بعض چھوٹے اور سطحی مسائل کو بہت بڑا بنا کر پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ اسلامی نظام حکومت کو ناکام و ناکارہ ثابت کرسکیں اور لوگ مذہبی نظام سے مایوس اور ناامید ہو جائیں اور وہ لوگ مذہب اور سیاست کے درمیان جدائی و علیحدگی کا بھرپور پروپگنڈہ کرسکیں لیکن مذہب اور مذہبی اقدار میں ہمارے عوام کا گہرا اعتقاد وایمان ان لوگوں کے اسلام دشمن منصوبوں کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ یہ لوگ اپنے پروپگنڈوں کے ذریعہ ملک کے نوجوانوں کو مایوس کردینا چاہتے ہیں اور اقتصادی پریشانی جواس وقت کم وبیش ساری دنیا میں رائج ہے فقط اسلامی جمہوریہ ایران کا ناقابل حل مسئلہ بنا کر پیش کررہے ہیں۔ یہ لوگ اپنے پروپگنڈوں کے ذریعہ امام خمینیؒ اور دیگر اراکین ورہنمایان انقلاب پر سوالیہ نشان لگانے کی کوشش کررہے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے اسلام سے چوٹ کھائی ہے اور اسلامی انقلاب کے ذریعہ زبردست نقصان اٹھایا ہے۔ انہیں پوری دنیا میں موجود اسلامی بیداری سے خطرہ محسوس ہورہا ہے اور سردست لبنان اور فلسطین میں اسلامی جدوجہد کے احیاء اور غیر معمولی فروغ سے یہ لوگ واقعاً بہت پریشان ہیں اور انہوں نے یہ طے کررکھا ہے کہ اسلامی فکر کی جڑ کاٹ دیں تاکہ اسلامیہ بیداری کا تناور درخت خشک ہوجائے۔ ان لوگوں نے اسلام اور مذہب کو اپنے زہر آلود تبلیغاتی تیروں کا نشانہ بنا رکھا ہے اور جیسے جیسے لبنان اور فلسطین کی اسلامی جدوجہد کا دامن وسیع ہورہا ہے اسلامی جمہوریۂ ایران کے خلاف امریکی اور اسرائیلی تعصّبات میں بالکل اسی رفتار سے اضافہ ہوتا جارہا ہے اور وہ لوگ بوکھلاہٹ کے عالم میں ہمارے خلاف

وسیع سازشوں کا جال پھیلاتے چلے جارہے ہیں لیکن انہیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ:

ان لوگوں کے پروپگنڈوں کے برخلاف ہمارے ملک کے ذمہ دار حاکموں اور سرکردہ لوگوں کے درمیان غیر معمولی وحدت واتحاد قائم ہے اور ملت اسلامیہ ایران اسلامی اور انقلابی مقاصد وارمانات کی بھرپور حمایت کرتی ہے اور فلسطین، وانتفاضہ کی حمایت اور صہیونیت واس کے طرفداروں کے خلاف بھرپور جدوجہد اسلامی جمہوریہ ایران کی سیاست کا اہم بنیادی رکن ہے۔ ہمارا عقیدہ وایمان ہے کہ ملت اسلامیہ فلسطین کی مسلسل جدوجہد اور دنیای اسلام کی حمایت کے سایہ میں فلسطین آزاد ہو جائے گا اور بیت المقدس ومسجد الاقصیٰ دنیائے اسلام کی آغوش میں واپس آجائے گا۔انشاء الله والله غالب علی امرہ...

والسّلام علیکم ورحمة اللّٰہ برکاته

خانہ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران

میں

جدید فارسی مراسلاتی کورس کا اہتمام

☆☆☆

داخلہ فارم اور مزید اطلاعات کے لئے راہ اسلام کا

گذشتہ شمارہ ۱۸۰ ملاحظہ کیجئے۔

ہندوستان میں

عزاداری امام حسینؑ کی ابتداء

فروغ اور دور انحطاط

پروفیسر سید محمد عزیزالدین حسین
جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

ہندوستان میں عزاداری امام حسینؑ کی روایت ۱۳ویں صدی عیسوی سے ملتی ہے۔ اس میں بعض صوفیاء کرام کا بھی حصہ کہا جاسکتا ہے۔ اس زمانے سے صوفیاء نے ہندوستان میں خانقاہیں تو قائم ہی کیں مگر بعض صوفیاء نے امام باڑے بھی تعمیر کئے۔ مندر اور مسجد، دونوں کے دروازے دوسرے مذاہب کے پیرووں کے لئے بند تھے۔ اس کے برعکس خانقاہ اور امام باڑے کا مزاج ان سے بالکل مختلف تھا۔ ان کے دروازے دوسرے مذاہب کے لوگوں کیلئے کھلے ہوئے تھے اور وہ مزاج آج تک قائم ہے۔ یہاں ہونے والی مجالس میں بلا تفریق مذہب و ملت لوگ شریک ہوتے ہیں۔ عزاداری امام حسین کو چار ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا دور عہد سلطنت ۱۲۰۶ء سے ۱۵۲۶ء تک دوسرا دور ۱۵۲۶ء سے ۱۷۵۷ء تک تیسرا دور ۱۷۵۷ء سے ۱۹۴۷ تک اور چوتھا دور ۱۹۴۷ کے بعد کا زمانہ۔

عزاداری امام حسین کی بنیاد قرآن کے ۲۵ویں پارے کی ۳۲ویں آیت، قل لا اسئلکم علیه اجرا الا المودة فی القربی ''کہہ دیجئے کہ میں تم سے اجر طلب نہیں

کرتا بجز اس کے کہ میرے قرابت داروں سے محبت کرو" اہل سنت اور اہل تشیع کے متفقہ دینی پیشوا حضرت میر سید علی ہمدانی علیہ الرحمہ نے تو اس موضوع پر ایک کتاب تصنیف فرمائی اور اس کا نام انہوں نے مودۃ القربیٰ رکھا۔ اس آیت کی تفسیر وہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں "آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے اے لوگو! تم خدا کو دوست رکھو اس لئے کہ اس نے اپنی نعمتیں تم کو عطا فرمائیں اور محبت خدا کے لئے مجھ سے محبت رکھو اور میری محبت کے لئے میرے اہل بیت کو دوست رکھو۔ پس آل نبیؐ کی دوستی کی بابت سوال کیا گیا اور وہ ہم سے طلب کی گئی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا ہے کہ اپنی امت سے اپنے ذوالقربیٰ کی دوستی کے سوا اور کچھ طلب نہ کریں اور یہ دوستی ان کے لئے باعث نجات آخرت ہے اور آنحضرت اور ان کے اہلبیت اطہار سے توسل کا ذریعہ ہے جو کوئی خدا تک پہونچنے اور اس کی جناب میں مقبول ہونے کا طالب ہو اس پر واجب ہے کہ رسولؐ خدا سے محبت رکھے اور اہل بیت رسولؐ خدا سے محبت رکھے اور اہل بیت رسولؐ کی دوستی اختیار کرے اور یہ بات آنحضرت کے آل اطہار کے فضائل کی معرفت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی" آخر میں میر سید علی ہمدانی فرماتے ہیں کہ میں نے اس کتاب کا نام مودۃ القربیٰ اس لئے رکھا تاکہ مجھ کو اللہ تعالیٰ اور اس کو ان حضرات سے میرے علاقائی ہونے کا ذریعہ بنائے گا اور ان کے ذریعے سے مجھ کو نجات عطا فرمائے گا۔ رباعی میں فرماتے ہیں۔

گر حب علی و آل نبوت نبود — امید شفاعت ز رسولت نبود
در طاقت حق جملہ بجا آوری تو — بے مہر علی ہیچ قبولیت نبود

صوفیائے کرام اسلام پر قائم تھے۔ ایک قرآن دوسرے سنت نبوی صلی اللہ علیہ

ولہ وسلم اور تیسرے محبت اہل بیت رسولؐ۔ امام جعفر صادق صوفی کی تعریف ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں۔ ”من عاشق فی باطن الرسول فهو صوفی “[۲] جو شخص اخلاق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آراستہ ہو جاوے اور اس امر کو اختیار کرے جو رسولؐ نے اختیار فرمایا اور رغبت کرے اس طرف جدھر رسولؐ نے رغبت فرمائی اور پرہیز کرے اس سے جسے رسولؐ نے چھوڑا تو گویا اس نے صفائے قلب حاصل کر لیا“ صوفیا نے کبھی اپنے آپ کو کسی فرقے سے منسلک نہیں کیا۔ کسی صوفی کے ملفوظات میں یہ نہیں ملتا کہ ان کا تعلق کسی خاص فرقے سے تھا۔ وہ فرقہ واریت کے اصولی طور سے قائل ہی نہ تھے۔ ان کی خانقاہیں اسلامی اتحاد کا قوی و مستحکم حصار تھیں جہاں باہمی اخوت اور ہمدردی کی پائیداری بنیاد پڑی تھیں۔

ہندوستان آکر صوفیاء نے اسلام کی تبلیغ کی۔ قرآن وسنت نبوی پر عمل کرنے کی ہدایت اور اہل بیت نبوی سے محبت۔ ان کی تبلیغ کے یہی دو محور تھے۔ صوفیا اپنے دور دراز وطن سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے اور ہندوستان کے مختلف شہروں، قصبات اور گاؤں میں سکونت اختیار کر کے اپنی خانقاہوں کی بنیاد ڈالی اور اس طرح انہوں نے شمالی ہندوستان میں اپنی روحانی ولایتیں قائم کیں۔ کئی صوفی سلسلے آئے جن میں چشتی اور سہروردی سلسلوں نے ہندوستان میں تبلیغ اسلام کے سلسلہ میں اہم کردار ادا کیا۔ چشتی صوفیاء نے پہلے اجمیر اور اس کے بعد دہلی کو اپنا مرکز بنایا۔ سہروردی صوفیاء نے ملتان کو اپنا مرکز بنایا۔ ان صوفیاء نے خاص طور سے قصبات اور گاؤں میں تبلیغ کا کام کیا۔ قصبات اور گاؤں میں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ ان حالات میں وہاں جا کر رہنا خود ایک جہاد تھا اس لئے کہ صوفیاء صرف مسلمانوں میں ہی تبلیغ نہیں کرتے تھے بلکہ وہ ہندوؤں کے درمیان رہ کر

بھی تبلیغ اسلام کے فرائض انجام دیتے تھے اس کے لئے انہوں نے خانقاہ کے دروازے ہندوؤں کے لئے کھول دیئے۔ صوفیاء کے اس تبلیغی مشن نے ہندوؤں کو کافی متاثر کیا اور اس طرح سے اسلام کی تعلیمات ہندوؤں تک پہنچیں۔

نہ جانے کیوں شیعہ حضرات میں صوفی تحریک اور صوفیاء کے بارے میں یہ سمجھ پیدا ہو گئی یا پیدا کر دی گئی کہ تصوف اور صوفیاء سے شیعوں کا کوئی تعلق نہیں ہے۔اس کی وجہ لاعلمی بھی ہو سکتی ہے ،اسی طرح اہل سنت حضرات بھی یہ سمجھتے ہیں کہ شیعوں کا تصوف سے کوئی تعلق نہیں۔۱۶ویں صدی عیسوی کے ایک شیعہ عالم قاضی سید نوراللہ شوستری نے اپنی کتاب مجالس المومنین سے میں ایک باب تصوف پر بھی قائم کیا ہے اور اس کے متعلق مسائل سے بحث کی ہے اور اسی کے ساتھ کچھ صوفیاء کی سوانح بھی قلم بند کی ہیں۔ اور تصوف کو مذہب حقہ کہا ہے۔عجیب بات یہ ہے کہ ہندوستان کے زیادہ تر سادات اثناء عشری کے مورث اعلیٰ صوفیاء ہی تھے۔سادات امروہہ ضلع مراد آباد کے سید شرف الدین شاہ ولایت، سادات میمن، ضلع بجنور کے سید اشرف، سادات سری نگر اور سادات جلائی، ضلع علی گڑھ کے میر سید علی ہمدانی، سادات سرسی ضلع مراد آباد کے شاہ ولایت اور اسی طرح سے زیادہ تر دوسرے قصبات کے سادات اثنا عشری بھی صوفیاء ہی کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔

انہیں صوفیاء نے مودۃ القربیٰ کے لئے عزاداری امام حسین کو ایک ذریعہ بنایا۔ نذر و نیاز کے طریقے اور عزاداری کی رسومات صوفیاء نے قائم کیں۔ یہ سب توسل اہل بیت کے طریقے ہیں۔ عزاداری امام حسین یا اس کی رسومات اور نذر و نیاز کے طریقے کہیں لکھے ہوئے نہیں ہیں بلکہ صوفیاء کے مزاج کے مطابق یہ طریقے سینہ بہ سینہ، پشت در پشت

ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچتے رہے۔ ۱۳ویں صدی عیسوی سے لے کر ۲۰ویں صدی کے اختتام تک عزاداری امام حسینؑ اور اس کی رسومات سے متعلق کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ حسین علی کربلائی نے تحفۃ العوام ۱۲۹۵ھ لکھی جس پر زیادہ تر شیعہ علماء و مجتہدین توثیق کرتے رہے۔ اس پر آٹھ جید علماء اثناء عشری کے دستخط موجود ہیں۔ صفحہ ۱۴۲ سے ۱۵۴ تک ۲۰ویں باب میں ماہ محرم کے اعمال میں یہ اعمال صرف شب عاشورا سے لیکر آخر روز عاشور تک کے ہیں۔ حالانکہ حصہ سوم و چہارم کا بعد میں اضافہ بھی کیا گیا لیکن اس اضافہ میں بھی عزاداری امام حسینؑ کے باب کا اضافہ نہیں کیا گیا۔ مقدمہ میں چوتھی فصل میں امامت پر بیان ہے۔ اس میں بھی عزاداری امام حسینؑ یا نذر و نیاز کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ یہ اعمال شب عاشورا سے لیکر آخر روز عاشورا تک صرف پانچ گھنٹے میں ختم ہو جاتے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عزاداری امام حسینؑ کا جو سلسلہ پہلی محرم سے بارہ محرم تک ہوتا ہے یہ کس کی دین ہے؟ اور اس کا ماخذ کیا؟ اس کے بانی صوفیاء تھے اور اس کا ماخذ صوفیاء اور ان کی نسلوں کے سینے تھے جہاں عزاداری امام حسینؑ کی رسومات محفوظ تھیں جو نسل نسل ایک کے بعد دوسرے کو منتقل ہوتی رہیں۔ اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ عزاداری امام حسینؑ کی کچھ رسومات پر علماء کو اعتراض بھی ہے۔ اس دور میں عزاداری امام حسینؑ پہلی محرم سے بارہ محرم تک اور صرف بیس صفر کو چہلم شہدائے کربلا ہوتا تھا۔ عزاداری کو آٹھ ربیع الاوّل تک جاری رکھنا ۱۸ویں صدی کا اضافہ ہے۔

مجالس کس طرح منعقد کریں، تعزیہ کس طرح بنائیں، علم کس طرح کا ہو وغیرہ وغیرہ یہ سب زبانی تھا۔ ابھی ۱۲ر اپریل ۹۸ء کو اپنے دوست ڈاکٹر نسیم اختر، جناب حسیب احمد اور جناب اقبال کے ہمراہ درگاہ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ زیارت کے واسطے گیا۔

دیکھا کہ درگاہ کے ایک گنبد پر ایک علم نصب ہے۔ یہ علم بالکل ویسا ہی تھا جیسا کہ دس محرم کو جلالی کے بڑے امام باڑے میں سوار ہوتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان علموں کا تعلق صوفی فکر سے ہے اس لئے کہ جلالی میں بھی عزاداری امام حسین صوفیا ہی کی قائم کی ہوئی ہے۔ جلالی میں محرم کی مجالس میں سب سے پہلے وہ مجلس خوانی ہوتی ہے جو آج تک جاری ہے۔ ۷ اس مجلس میں پہلی مجلس حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور باقی دوسری مجالس اہل بیت اور شہدائے کربلا سے متعلق ہیں۔ ان میں حضرات کے فضائل و مصائب بیان کئے جاتے ہیں۔

صوفیاء نے ہندوستان میں عزاداری امام حسینؑ کے نظام کو اس طرح ترتیب دیا کہ فن کار کاریگر اور مزدور کو نظام عزاداری میں اس کے ہنر کے ساتھ جوڑ دیا۔ حلوائی' بڑھئی' ٹھیلیا' درزی کارچوبی والے' ڈھول تاشے والے' مراثی' نان وائی، تیلی' کہار' سقے' فقراء' مالی' اور مجاور وغیرہ۔ اگر ایک کاریگر یا مزدور کو عزاداری امام حسین کا فلسفہ سمجھایا جاتا تو اس کی مجھ میں کچھ نہ آتا۔ اسی لئے ان کو انکے فن کے ساتھ عزاداری امام حسین سے جوڑ دیا تاکہ وہ ان کی زندگی اور فکر کا حصہ بن جائے اس کا عزاداری امام حسین سے دلی لگاؤ پیدا ہو جائے اور اس مشن میں صوفیاء کامیاب ہو گئے۔ ماہرین تعلیم نے تعلیم کو پیشے سے جوڑنے کا سبق تو بیسویں صدی میں دیا' ۸ صوفیاء نے ہندوستان میں عزاداری امام حسین کو پیشے سے جوڑنے کا کام ۱۳ویں صدی عیسوی میں ہی کامیابی کے ساتھ انجام دیدیا تھا۔ اور یہ ان کی بین کرامت تھی۔

عزاداری امام حسینؑ کے مرکز کا نام امام باڑہ رکھا گیا۔ یہ قطعی طور پر ہندوستانی اس طرح تھا کہ اس سے پہلے عرب ایران اور دوسرے مسلم ممالک میں اس نام کا کوئی

ادارہ نہیں تھا۔ اس میں امام کے ساتھ ایک ہندی لفظ باڑہ سے ملا کر امام باڑہ بنادیا۔ تاکہ اس سے اس کا ہندوستانی مزاج جھلکے۔ اس کا نام بڑے غور وفکر کے بعد اس زبان میں نہیں رکھا گیا کہ جس میں قرآن نازل ہوا یا جس زبان کو امام حسینؑ بولتے تھے اور نہ فارسی کا کوئی نام رکھا۔ جب کہ یہی دو زبانیں مذہب اسلام اور اسلامی ثقافت سے قریب تر تھیں۔ یہ صوفیاء کی فکر کا نفسیاتی پہلو تھا اگر باہر کے ناموں اور زبان سے ہندوستان میں کوئی مرکز بنایا جائے گا تو اس کی جڑیں ہندوستانی سماج میں گہری نہ ہو سکیں گی۔ امام باڑے کے دروازے بھی بلا تفریق مذہب وملت سب کے لئے کھول دیئے گئے۔ یہ ہندوستان میں ایک نیا تجربہ تھا۔ نیچی ذات کے ہندو اگر چہ اپنے مندروں میں نہیں جاسکتے تھے لیکن امام باڑوں میں ہونے والی عزاداری حسینؑ میں شرکت کرنے لگے اور آہستہ آہستہ عزاداری حسینؑ ان کی زندگی کا جزو بن گئی۔ اور اس طرح ہندوستان میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ عزاداری امام حسینؑ میں شرکت کے لئے تبدیلیٔ مذہب کی کوئی شرط نہ تھی۔ اپنے دھرم پر قائم رہ کر نواسۂ رسولؐ کو نذرانۂ محبت پیش کر سکتے تھے۔ دس محرم کو ہندو بھی تعزیوں کی زیارت کرتے اور کربلا کے پیاسے شہیدوں کی یاد میں اپنے محلوں میں شربت کی سبیل لگاتے۔ لوگ اس تبرک کو پیتے وقت من ہی من میں گنگناتے۔

بھارت میں اگر آجاتا یوں پیا سا نہ ماراجاتا

مرقعہ دہلی میں ۱۷۷۱ء سے متعلق ایک بیان ملتا ہے کہ "درگاہ شاہ مرداں میں بارہ محرم کو ایک مجلس عزا ہوتی ہے۔ اس مجلس میں دہلی کا کوئی شخص ایسا نہ ہوتا جو اس میں شرکت نہ کرتا ہو۔ تاحد نگاہ سواریاں ہی سواریاں نظر آتیں۔ مالدار غریب' چھوٹے بڑے غرض کہ سب لوگ ہی شرکت کے لئے یہاں آتے" ۱۷۷۱ء کا یہ بیان بڑی اہمیت کا حامل

ہے کہ اس وقت تک عزاداری امام حسین میں دہلی کے تمام لوگ یعنی ہندو اور مسلمان شرکت کرتے تھے۔ ۹

تیرھویں صدی عیسوی سے لیکر سولھویں صدی عیسوی تک عزاداری امام حسین امام باڑوں میں ہوتی اور جلوس کا کوئی رواج نہ تھا۔ اس دور میں کچھ سلاطین کے دور میں عزاداری امام حسین خفیہ طور پر ہوئی۔ اس لئے کہ خود صوفی تحریک کا قیام مسلمانوں میں موروثی ملوکیت کے خلاف احتجاج کی وجہ سے ہوا جس کے بانی حضرت معاویہ ابن ابوسفیان تھے۔ حضرت نظام الدین اولیاء کے مرید مولانا ضیاء الدین برنی اپنی کتاب تاریخ فیروز شاہی میں لکھتے ہیں کہ "حضرت معاویہ اور امیر المومنین حضرت عثمان کے دوسرے عزیزوں نے جو اپنے حصہ مملکت میں وسیع علاقوں کے مالک تھے اور قوت اور اقتدار حاصل کر چکے تھے علی مرتضیٰؑ کے خلاف بغاوت و سرکشی کی، ان سے بیعت نہیں کی اور فساد شروع کردیا۔" ۱۰ امام حسینؑ نے اسی موروثی ملوکیت کی بیعت کرنے سے انکار کردیا جس کے نتیجے میں انکی شہادت واقع ہوئی۔

عجیب سانحہ ہے کہ جس اسلامی سیاسی نظام کی بنیاد حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ڈالی تھی اور جس کی پیروی خلفاء راشدین نے کی وہ تو ۶۶۱ء میں ختم ہوگیا لیکن جس موروثی ملوکیت کی بنیاد معاویہ نے ۶۶۱ء میں ڈالی وہ آج تک مسلم ممالک میں قائم ہے۔ سلاطین دہلی بھی بغداد کے موروثی ملوک ہی کی سرپرستی میں ہندوستان میں سلطان کی حیثیت سے حکومت کررہے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسی حکومت میں اعلانیہ طور پر عزاداری امام حسین ممکن نہ تھی۔ اس لئے کہ حسین کا نام ہی موروثی ملوکیت کے خلاف احتجاج تھا۔ محمد بن تغلق ابن تیمیہ کی فکر سے متاثر تھا۔ اس نے صوفی تحریک اور صوفیاء کے

خلاف سخت اقدامات کئے اور اس طرح اس عہد کے مختلف ادوار میں صوفیاء سلطان کے عتاب کا شکار ہوئے۔ خلافت وملوکیت کے مسئلہ پر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے سیر حاصل بحث اسی عنوان پر اپنی کتاب میں کی ہے۔[اا]

عزاداری امام حسینؑ ایک مکمل ادارہ ہے۔ جس کی باقاعدہ اصطلاحات ہیں۔ یہ اصطلاحات نہ تو کسی عربی، فارسی یا اردو کی ڈکشنری میں ملیں گی اور نہ ہی شیعہ علماء کی کتابوں میں، عزاداری امام حسین سے متعلق اصطلاحات صوفیاء ہی کی دین ہیں۔ نذر و نیاز علم سے متعلق دو صورتیں ہیں، علم نصب کرنا اور علم سوار کرنا۔ یہ دونوں قطعی طور پر علیحدہ علیحدہ صورتیں ہیں اور انہیں وہی شخص سمجھ سکتا ہے کہ جس نے عزادری کے نظام کو بچپن سے دیکھا ہے، سمجھا ہے اور اس پر عمل کیا ہے۔ ان اصطلاحات کا استعمال اردو مرثیہ گو شعراء میر انیس اور مرزا دبیر کے مراثی میں ہوا ہے اور وہ اس لئے کہ یہ مرثیہ گو شعراء تصوف سے حد درجہ متاثر تھے۔

عزاداری حسین کا دوسرا دور سولھویں صدی عیسوی سے شروع ہوتا ہے جب مغل بادشاہ ہندوستان آئے اور اپنی حکومت قائم کی۔ مغل بادشاہوں کو اہل بیت سے عقیدت تھی۔ اسی لئے انہوں نے عزاداری امام حسینؑ پر کوئی پابندی نہیں لگائی لیکن تورانی علماء اور امراء کو اہل بیت سے ایسی کوئی خاص عقیدت نہ تھی اسی لئے بعض معاملات میں انہوں نے سختی رکھی۔ لیکن ہمایوں کی ایران سے واپسی پر ایرانی علماء اور امراء بھی اس کے ساتھ آئے اور ان کے لئے مغل حکومت کے دروازے کھول دیئے گئے۔ جس کی وجہ سے ایرانی علماء اور امراء کا ہندوستان آنے کا سلسلہ جاری رہا۔ لیکن اکبر کے عہد کے پہلے دور میں یعنی ۱۵۵۶ء سے ۱۵۸۰ء تک ایرانی علماء امراء اور تورانی علماء اور امراء میں درباری

سیاست اور مذہبی عقائد کو لے کر کشمکش شروع ہو گئی۔ اکبر خود مخدوم الملک عبد اللہ سلطان پوری اور شیخ عبد النبی جیسے علماء کے زیر اثر رہا۔ ۱۲؎ ان کے علاوہ بھی اکبر کے عہد میں دوسرے ایسے عناصر بھی موجود تھے جو چشتی اور سہروردی صوفیاء کی ترکیبی حکمت عملی کے مخالف تھے۔ خود شیخ احمد نقشبندی سرہندی نہ صرف بین المذاہبی رواداری کے قائل نہ تھے بلکہ ان کے نزدیک غیر سنی مسلمان بھی کافروں کی حیثیت رکھتے تھے۔ ۱۳؎ اکبر نے ایسے عناصر کی پروا کئے بغیر ۱۶۸۰ء میں ہندوستان میں صلح کل کی پالیسی کی بنیاد ڈالی اور تمام مذاہب کے لوگوں کو مذہبی آزادی دی۔ ظاہر ہے کہ اس تبدیلی کا اثر عزاداری امام حسین کی نشر و اشاعت کے لئے مددگار ثابت ہوا۔ عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں پہلی مرتبہ ایک ایرانی شیعہ عالم سید نور اللہ شوستری کو لاہور کا قاضی بنایا گیا۔ ۱۴؎ ایسی حکومت میں جہاں حنفی فقہ کی پیروی ہوتی تھی۔ اس دور میں عزاداری امام حسینؑ کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ جہانگیر اور شاہ جہاں کے دور میں بھی یہ آزادی رہی۔ جب اورنگزیب بادشاہ بنا تو اس کا رجحان مذہب کی طرف اپنے اجداد سے زیادہ تھا۔ اورنگزیب کو اہل بیت سے بڑی عقیدت تھی۔ اس کے رقعات اور احکامات اسکے اس رجحان کی پوری طرح عکاسی کرتے ہیں۔ اورنگزیب نے اپنے وصیت نامے میں تحریر کیا ہے کہ ''لازم السعادات' سادات بارہہ کے ساتھ احترام ورعایت میں کوئی فروگذاشت نہیں کرنی چاہئے اور قل لا اسئلكم عليه اجرا الا مودة فی القربیٰ کی آیت شریفہ کے بموجب عمل کرنا چاہئے کیونکہ آیت کریمہ ''کہہ دیجئے کہ میں تم سے اس پر کوئی اجر طلب نہیں کرتا بجز اس کے کہ میرے عزیزوں سے محبت کرو'' کے مطابق یہ جماعت اجر نبوت کی مستحق ہے۔ اس میں ہرگز کوتاہی نہ کرنی چاہئے کہ دنیاو آخرت میں خیر وفلاح کا باعث ہے' ۱۵؎ یہ وصیت نامہ بارہ

نکات پر مشتمل ہے۔ اسکے متعلق اورنگزیب نے لکھا ہے کہ "اثنا عشر کا عدد مبارک ہے اور وصیت کا اختتام بھی اثنا عشر پر کیا جاتا ہے"۔ ۱۶؎ ایک اور رقعہ میں لکھتا ہے کہ "سادات سے محبت اور عزت کرنا ہمارے مذہب کا حصہ ہے اور ان سے نفرت اور دشمنی رکھنے والے کے لئے جہنم ہے۔" ۱۷؎ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جب اورنگزیب کا سادات کے بارے میں یہ عقیدہ ہے تو اہل بیت سے کس درجہ مودت ہوگی۔ لیکن جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ مغل دور میں اس کے خلاف بھی ذہن موجود تھے۔ صادق خاں' طبقات عالمگیری میں عہد اورنگزیب کا واقعہ لکھتے ہیں کہ جب گلکنڈہ کا محاصرہ چل رہا تھا تو کچھ لوگوں نے صف شکن خاں تورانی سے جو کمانڈر تھا کہا کہ قلعہ تو فتح ہو ہی جائے گا وہاں غذا اور پانی جانے میں زیادہ سختی نہ کریں اس لئے کہ قلعہ کے اندر علماء اور سادات صحیح النسب بھی موجود ہیں۔ صف شکن خاں نے جواب دیا کہ "اگر امام حسینؑ بھی اس قلعہ میں موجود ہوتے تو بھی میں سختی میں کوئی کمی نہ کرتا۔" ۱۸؎ جب اس واقعہ کی اطلاع اورنگزیب کو ہوئی تو اورنگزیب نے اس کو اس کے منصب سے برطرف کر کے جیل خانے میں ڈلوا دیا۔ فرزند علی مونگیری ملخص التواریخ میں عہد اورنگزیب کا ہی واقعہ لکھتے ہیں کہ "میر جملہ عظیم آباد گئے تو امراء ان کے پاس حاضری کے لئے آئے لیکن نعمت اللہ خاں ایام عاشورا میں عزاداری امام حسینؑ میں مشغول رہنے کی وجہ سے ان ایام کے بعد حاضر ہوئے۔ اس وقت محمد امین خاں بھی موجود تھے۔ میر جملہ نے کہا کہ آپ اتنے روز بعد کیوں آئے۔ انہوں نے جواب دیا۔ کہ ماتم داری میں مشغول تھا اس لئے معافی کا خواستگار ہوں۔ محمد امین خاں نے کہا کہ کیا آپ کے گھر کسی کی موت ہوگئی تھی۔ نعمت اللہ خاں نے کہ شہادت حسینؑ واقع ہوئی ہے۔ محمد امین خاں نے کہا کہ اس کے کیا معنی یزید اور حسینؑ تو ایک دوسرے کے بھائی تھے۔

عجیب بات ہے کہ آپ ایک بھائی کا تو ماتم کریں اور دوسرے کی خوشی میں شامل نہ ہوں۔ نعمت اللہ خاں نے جواب دیا کہ جن سے ہمارا تعلق ہے انہیں شہید کردیا گیا اس لئے ہم ماتم کرتے ہیں۔ آپ کے بھائی کو فتح حاصل ہوئی آپ خوشیاں منایئے۔ ۱۹؎

عہد اورنگزیب کے اختتام سے پہلے ہی کشیدگی اور حالات خراب ہونا شروع ہوگئے تھے۔ وحدت الوجودی رویے نے مذہبی امتیازات کو ختم کرنے کی ترغیب دی۔ وحدت الشہودی رویے نے تقسیم کو ہی اپنا نصب العین قرار دیا اور بالآخر اہل اسلام کے مختلف فرقوں میں بھی اتحاد وابلاغ کے تمام وسیلے تباہ کردئے گئے۔ شیخ احمد سرہندی کے صاحبزادے شیخ محمد معصوم نقشبندی نے عالمگیر کو شیعوں کا قتل عام کرنے کی ترغیب دیتے ہوئے لکھا کہ "ابن عباس نے روایت کی کہ آخری زمانے میں ایسے لوگ ہوں گے جن کو روافض کہیں گے۔ یہ اسلام کی توہین کرنے والے اور مشرک ہوں گے ان کو قتل کردینا" ۲۰؎ اورنگزیب اس حد تک تو نہ جاسکا تاہم اس کے زمانے میں کچھ معاشی بحران کی بنا پر درباری سیاست اور کچھ مذہبی بنیادوں پر اس کے زمانے میں شیعہ سنی اختلافات نے خراب صورت اختیار کرلی۔ خود اورنگزیب کی تحلیلی حکمت عملی کا نتیجہ صرف یہ نہیں تھا کہ مغل حکومت کی غیر مسلم اکثریت مغائرت کا شکار ہوگئی اور اس کے مراکز تبدیل ہوگئے بلکہ خود مسلمانوں میں فرقہ وارانہ رجحانات شدت اختیار کرگئے۔ امت کا اتحاد ختم ہونا شروع ہوگیا۔ ان تمام حالات کا اثر عزاداری امام حسینؑ پر پڑنا شروع ہوا۔ مغل بادشاہ بہادر شاہ اول کے دور میں شیعہ سنی تنازعات نے فرقہ وارانہ فساد کی شکل اختیار کرلی۔ ۲۱؎ اکبر نے اسلام کو انسان دوستی کے مساوی قرار دیا تھا اور اس سے نسل انسانی کی اجتماعی فلاح مراد لی تھی لیکن اٹھارویں صدی کے مغل ہندوستان میں اسلام کی وسیع تر توجیہہ کو نہ

صرف مسترد کر دیا گیا بلکہ نظری اور عملی دونوں سطحوں پر اسلام کو ایک فرقے کے عقائد میں ضم کر دیا گیا۔

مغل حکومت زوال پذیر ہوئی اور علاقائی حکومتوں کا وجود عمل میں آیا۔ اودھ میں نواب شجاع الدولہ کا عروج ہوا۔ انہوں نے عزاداری امام حسینؑ پر خاص توجہ دی۔ امام باڑوں کو معافیاں دیں تاکہ لوگ عزاداری امام حسین پورے اطمینان وانہماک سے انجام دیں۔ اسی وجہ سے بعض علماء اور دانشوروں کا خیال ہے کہ نوابان اودھ کے عہد میں عزاداری امام حسینؑ کو عروج حاصل ہوا۔ لیکن میری رائے اس سے مختلف ہے اس لئے کہ اٹھارہ ویں صدی میں ہی عزاداری امام حسین انحطاط کی طرف مائل ہو گئی۔ اگر ہم عزاداری امام حسین کا جائزہ پورے شمالی ہندوستان میں لیں تو اب مسلمانوں میں اتحاد کی جگہ فرقہ واریت نے لے لی تھی۔ اور عزاداری امام حسین کی وسعت ختم ہو رہی تھی۔ محرم میں سنیوں کے جلوس علیحدہ اور شیعوں کے جلوس علیحدہ نکلنا شروع ہو گئے۔ ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد نے تو اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ جس کی وجہ کچھ تو ان سے علحدگی اور کچھ یہ تھی کہ ان کے ہاں خود اصلاحی تحریکیں شروع ہو چکی تھیں۔ فرقہ پرست دانشور اس مسئلے پر ایرانی تورانی حوالوں سے بحث کرتے تھے جس کے نتیجے میں شیعہ سنی اختلافات شدت اختیار کر رہے تھے۔

اسی دور میں شاہ ولی اللہ نے مسلمانوں میں اتحاد قائم کرنے کے لئے تحریک شروع کی۔ شاہ ولی اللہ کا بھی نسب والدہ کی جانب سے امام موسیٰ کاظم تک پہونچتا ہے۔ ۲۲ شاہ ولی اللہ نے سب سے پہلے اس تورانی تصور کی تردید کی کہ شیعہ مشرک ہیں لہٰذا واجب القتل ہیں۔ ۲۳ اس دور میں نہ صرف فرقہ واریت پیدا ہو چکی تھی بلکہ لسانی عصبیت بھی

اس حد تک پیدا ہو چکی تھی کہ جس وقت شاہ ولی اللہ قرآن کے فارسی ترجمے میں مشغول تھے تو کچھ علماء ان کے مخالف ہو گئے اور ترجمہ کو بدعت قرار دیا۔ایک دفعہ وہ مسجد فتح پوری میں نماز کیلئے گئے تو مسلمان ایک کثیر تعداد میں وہاں جمع ہو گئے اور ان کی جان کو خطرہ ہو گیا۔۲۴ بقول شاہ عبدالعزیز "ایک شخص نے والد ماجد سے شیعوں کے کافر ہونے کے متعلق فتویٰ پوچھا۔ آپ نے کہا کہ علماء حنفیہ میں اس پر اختلاف ہے۔ جب دوسری مرتبہ یہی سوال ہوا اور یہی جواب ملا تو اس نے کہا کہ یہ شخص شیعہ ہے۔"۲۵ جہاں تک محبت اہل بیت کا تعلق ہے تو شاہ ولی اللہ فیوض الحرمین میں لکھتے ہیں کہ "میری طبیعت اور میری فکر کو جب اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے تو دونوں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو فضیلت دیں۔۲۶ ان حالات سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس دور میں عزاداری امام حسین بھی متاثر ہوئی ہو گی۔

شاہ عبدالعزیز نے سرّالشہادتین لکھی۔ اس کتاب کی بنیاد پر بعض لوگ شاہ عبدالعزیز کو شیعہ تصور کرتے تھے۔۲۷ ملفوظات کے مطابق "حافظ آفتاب میرے درس میں شامل ہوتے تھے ایک روز حضرت علیؑ کا ذکر شروع ہوا۔ حضرت علیؑ کے مناقب بیان کرنے شروع کر دئے۔ اس روہیلہ پٹھان نے شیعہ سمجھ کر درس میں آنا موقوف کر دیا۔۲۸ اس کے بعد شاہ عبدالعزیز نے ۹۰-۱۷۸۹ء میں تحفۂ اثنا عشریہ لکھی جو شیعی عقائد کے رد میں تھی۔ اس کے دیباچہ میں شاہ عبدالعزیز لکھتے ہیں کہ "اس کتاب کی تالیف کی غرض اور ضرورت اس لئے محسوس کی گئی کہ جس دور سے ہم گذر رہے ہیں اور جس زمانے میں ہم زندگی گذار رہے ہیں اس میں اثنا عشریہ کا غلبہ اور شہرہ اتنا بڑھ گیا ہے کہ بہ مشکل کوئی گھر ایسا ہو گا جس میں کوئی نہ کوئی شخص یہ مذہب اختیار نہ کر چکا ہو یا اس سے متاثر نہ ہوا ہو۔"۲۹

شاہ عبدالعزیز کا یہ جملہ دعوت فکر دیتا ہے کہ آخر ایسے کون سے محرکات تھے کہ جن کی وجہ سے شیعی عقائد کو اس درجہ فروغ حاصل ہوا۔ اس لئے کہ جس دور کی بات شاہ عبدالعزیز کر رہے ہیں اس میں شیعہ مجتہدین کا وجود بھی نہ تھا۔ دراصل ان عقائد کی تبلیغ صوفیائے کرام نے کی تھی اور وہ یہی کہ محبت اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم جیسا کہ خود شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز کے ساتھ واقعات ان کے مذہبی رجحانات اور مناقب حضرت علی بیان کرنے کے سلسلے میں پیش آئے۔ صوفیاء نے جس اسلام کی تبلیغ کی وہ قرآن، سنت نبویؐ اور محبت اہل بیت پر مبنی تھا۔ اسی کی تبلیغ حضرت معین الدین چشتی، حضرت بہاءالدین سہروردی، حضرت نظام الدین اولیاء، میر سید علی ہمدانی سید شرف الدین شاہ ولایت، سید شاہ اشرف سید جہانگیر سمنانی سید محمد گیسودراز اور دوسرے صوفیائے کرام نے کی تھی۔ یہ شیعہ مجتہدین و علماء کا کارنامہ نہیں اس لئے کہ یہ ان کے وجود سے بہت پہلے کی بات ہے۔
تحفۂ اثنا عشریہ کے جواب میں حکیم مرزا محمد کامل، شہید رابع نے نزہۃ اثنا عشریہ لکھی اور مولوی سید دلدار علی شیعہ مجتہد اول نے ذوالفقار لکھی۔ بس اب کیا تھا کہ مناظرے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس مناظرے نے بھی عزاداری امام حسین کو نقصان پہونچایا۔ حالات کو مزید سنگین بنانے کے لئے کچھ من گھڑت روایات لکھی گئیں تاکہ شیعہ سنی اختلافات میں مزید اضافہ ہو اور شدت اختیار کریں۔ امیر شاہ خاں امیر الروایات میں شاہ عبدالعزیز کے متعلق اس طرح روایت بیان کرتے ہیں کہ ''اس زمانے میں روافض کا نہایت غلبہ تھا۔ چنانچہ دہلی میں نجف علی خاں کا تسلط تھا جس نے شاہ ولی اللہ کے پہنچے اتروا کر انہیں بیکار کر دیا تھا تاکہ وہ کوئی کتاب نہ لکھ سکیں۔ شاہ عبدالعزیز کو دہلی سے نکلوا دیا تھا۔ شاہ عبدالعزیز جونپور پیدل گئے کیونکہ ان کو سوار ہونے کا حکم نہ تھا۔''[۳۰] اس روایت کو اکابر سنی

علماء مولانا مناظر احسن گیلانی، مولنا محمد میاں اور مفتی انتظام اللہ شہابی نے شاہ عبد العزیز کی سوانح کے تحت اپنی کتابوں میں بھی نقل کیا ہے۔ ۱۳ دہلی پر نجف خاں کا اقتدار ۱۷۷۲ء سے ۱۷۸۲ء تک رہا۔ شاہ ولی اللہ انتقال ۱۷۶۲ء میں ہو چکا تھا۔ ۲۳ دوسرے یہ کہ بنیادی طور پر پہنچے اتروانے کا ذکر شاہ ولی اللہ کے کسی معاصر نے نہیں کیا۔ شاہ عبد العزیز نے تحفۂ اثنا عشریہ ۹۰-۱۷۸۹ء میں تصنیف کی جب کہ نجف خاں کا انتقال ۱۷۸۲ء میں ہو چکا تھا۔ ۳۳ شاہ عبد العزیز کے پیدل جونپور جانے کا تذکرہ بھی ان کے کسی اور معاصر نے نہیں کیا۔ ظاہر ہے کہ جب لوگوں نے اس طرح کی روایات ان علماء کے بارے میں پڑھی ہوں گی تو ان کی نفرت میں مزید اضافہ ہوا ہو گا جب کہ یہ روایت تاریخی شواہد کی روشنی میں قطعی بے بنیاد معلوم ہوتی ہیں۔

فارسی ادب میں تو اہل بیت سے عقیدت بہت صاف صاف جھلکتی ہے۔ لیکن اس دور کے اردو ادب میں بھی اہل بیت نبیؐ سے عقیدت حد درجہ نظر آتی ہے۔ میر جعفر زٹلی حضرت علی سے عقیدت کا اظہار ان اشعار میں اس طرح کرتے ہیں۔

کیوں نہ جعفر ہو ثنا خوان شہ خیبر کا   صدق باطن سے ہوا خاک در خیبر کا
ہے نہ وسواس اسے بھوت و سیہ اژدر کا   روز و شب یاد رکھے نام علی حیدر کا

میر تقی میر ان الفاظ میں مدح سرائی کرتے ہیں

ہادی علیؑ، رفیق علیؑ، رہنما علیؑ   یاور علیؑ، محمد علیؑ، آشنا علیؑ
مرشد علیؑ، کفیل علیؑ، پیشوا علیؑ   مقصد علیؑ، مراد علیؑ، مدعا علیؑ

مرزا غالب اپنے کلام میں حضرت علیؑ سے اپنی عقیدت کا اظہار ان اشعار میں اس طرح کرتے ہیں۔

ارزندہ گوہرے چوں من اندرزمانہ نیست
خود را بخاک رہگذر حیدر افگنم

ساغرپئ صبوح لبالب کنم زمئے چوناں کہ لب زمزمئے یاابوالحسن
چو برگ گل زباد سحر گاہی ام زباں رقصد بنام حیدر کرار در دہن

چھنولال دلگیر نے مراثی لکھے۔ جس میں سے ایک مرثیے کا مطلع ہے۔

پہونچے امیر شام کی مجلس میں جب اسیر

اس مرثیے میں ان حالات کی بڑے دل سوز انداز میں عکاسی کی ہے کہ جو اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اس لٹے ہوئے قافلے کی پیشی کے وقت یزید کے دربار میں پیش ہوئے۔

علامہ اقبال ٹوٹے ہوئے خانقاہی نظام میں دوبارہ زندگی بیدار کرنے کے لئے اس طرح سے ترغیب دیتے ہیں

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیری

مولانا محمد علی ان الفاظ میں مسلمانوں میں تحریک پیدا کرنے کے لئے نعرہ بلند کرتے ہیں۔

قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

مولانا ابو الکلام آزاد نے ایک کتاب ''شہید کربلا'' لکھی ۔ لیکن ان دونوں حضرات کے ہاں ایک مقام پر حد درجہ تضاد نظر آتا ہے۔ امام حسین کا احتجاج اور اس کے نتیجہ میں ان کی شہادت ملوکانہ موروثی نظام کے قیام کے خلاف بغاوت تھی۔ وہ دونوں علماء

یعنی مولانا محمد علی اور مولانا آزاد امام حسینؑ سے تو حد درجہ عقیدت رکھتے تھے لیکن ان دونوں حضرات نے غیر اسلامی ملوکانہ موروثی نظام کو نہ صرف خلافت کا نام دیا بلکہ اس کی حیات کو باقی رکھنے کیلئے ہندوستان میں خلافت تحریک چلائی۔ ان علماء کے یہ دونوں عمل قطعی طور پر متضاد تھے۔ مولانا شبلی نعمانی نے معرکۃ الآرا کتاب ''موازنہ انیس و دبیر'' لکھی۔

اب برٹش راج کا ہندوستان پر پوری طرح تسلط ہو گیا۔ صوفی تحریک میں ضعف واضمحلال کے آثار پہلے ہی نمایاں ہو چکے تھے۔ ہندو مسلم نفرت سترھویں صدی عیسوی کے اختتام سے شروع ہو چکی تھی۔ بقول سر سید احمد خاں ''اس برادرانہ محبت سے جو آپس میں تھی ۱۷۷۹ء میں عالمگیر کے عہد میں یہ محبت ٹوٹ گئی اور بہ سبب مقابلہ سرکشی قوم ہنود شیواجی مرہٹہ وغیرہ کے عالمگیر جملہ قوم ہنود سے ناراض ہوا اور اپنے صوبہ داروں کے نام حکم بھیجے کہ جملہ قوم ہنود کے ساتھ سخت گیری سے پیش آئیں اور ہر ایک سے جزیہ لیں پھر جو نفرت اور ناراضی رعایا کو ہوئی وہ ظاہر ہے۔'' اب اسکو برٹش سرکار کی سرپرستی میں مزید تقویت ملنا شروع ہوئی۔ مسلمانوں کے درمیان شیعہ سنی اختلافات اپنے عروج پر پہونچ گئے۔ انگریز اپنی حکومت کے قیام اور اس کے استحکام کے لئے ہندو مسلم نفرت اور شیعہ سنی اختلافات سے سیاسی فائدے اٹھانے کی ایک جامع اسکیم تیار کر چکے تھے۔ اس فرقہ پرستی نے ہندوستانی سیاست، سماج اور ثقافت کو مزید کمزور بنا دیا تھا۔ ہندوستانیوں کے سامنے ان مسائل کا کوئی حل نہ تھا اور نہ ہی ان کا کوئی رہبر یا رہنما تھا جو انہیں اس دلدل سے نکال کے لے جاتا۔ ان تمام ابتر حالات کی وجہ سے عزاداری امام حسینؑ بھی متاثر ہوئی۔ صوفیاء نے اپنی کوششوں سے یوم عاشورا کو ہندوستان میں تمام ہندوستانیوں کے لئے ایک غم کا دن بنا دیا تھا، اس دن ہر ہندو اور مسلمان اپنے کاروبار کو بند رکھتا اور امام حسینؑ کی

شہادت کو یاد کرتا تعزیوں کے جلوس نکالتے اور کربلا کے پیاسوں کی یاد میں شربت کی سبیلیں لگاتے۔ ابھی حال ہی میں انڈیا آفس لائبریری 'لندن میں ایک مخطوطہ مرأت الاحوال جہاں نما کے مطالعہ کا موقع ملا۔۱۸۰۶ء کے حوالے سے جمشید پور کے متعلق لکھاہے کہ "تمام ہندو اور مسلمان تعزیہ داری کرتے اور ایام عشرہ محرم میں کوئی بھی شخص چاہے مالدار ہو یا غریب شہر کے اندر سواری پر نہیں چل سکتا تھا۔ اگر کوئی شخص سواری پر غلطی سے بھی چلتا تو ہندو اور مسلمان دونوں مل کر اس کو ذلیل کرتے اور اس کو مجبور کر دیتے کہ وہ پیدل چل کر راستہ طے کرے۔"[۳۴] اب ایسا انقلاب آیا کہ اسی یوم عاشورا کو محرم کا جلوس ایک مسئلہ بن گیا۔ محرم کا جلوس لے کر ہندو مسلم فرقہ وارانہ فسادات ہونے لگے اور آہستہ آہستہ یہ سلسلہ محرم کے جلوس کی بنا پر شیعہ سنی فسادات تک پہونچ گیا اور خود ہندوستان میں ہی یوم عاشورا پر کربلا جیسے واقعات پیش آنے لگے۔ مدح صحابہ اور تبرئی ایجی ٹیشن شروع ہوئے۔ ہزاروں سنی اور شیعہ جیل گئے اور اس طرح شیعوں اور سنیوں کے درمیان ایک خلیج قائم ہوگئی۔ تبرئی ایجی ٹیشن کی حمایت سید علی ظہیر نے کی اور مدح صحابہ کا مسئلہ مولانا حسین احمد مدنی نے اٹھایا اور عجیب بات ہے کہ دونوں ایک ہی وقت میں یوپی کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبر بھی تھے۔ اس سے نہ صرف عزاداری امام حسینؑ متاثر ہوئی بلکہ آزادی کی تحریک بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ اس کے بعد سنیوں کے تعزیوں کے جلوس علیحدہ اور شیعوں کے جلوس علیحدہ علیحدہ نکلنا شروع ہوگئے اور ہندوؤں نے تو اس سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ کچھ مورخین اور دانشوروں کا کہنا ہے کہ یہ اختلافات سترھویں صدی کے اختتام سے ہی شروع ہوگئے تھے البتہ انگریزوں کے آنے کے بعد ان کی پالیسیوں کے نتیجے میں مزید شدت اختیار کرگئے۔ صوفیاء نے ترکیبی حکمت

عملی سے عزاداری امام حسین کو وسعت دی تھی جس میں بلا تفریق مذہب و ملت تمام ہندوستانی شریک ہوتے تھے۔ صوفی تحریک کمزور ہوئی، صوفیاء کے اثرات کم ہونا شروع ہوئے اور اب عزاداری امام حسینؑ علماء کے ہاتھوں میں پہنچی۔ علماء نے عزاداری امام حسینؑ کے سلسلے میں تحلیلی رویہ اپنایا جس کے نتیجے میں عزاداری امام حسین محدود ہوتی چلی گئی۔ علماء نے ایک خاص تبدیلی اس نظام کے سلسلے میں یہ کی کہ عزاداری امام حسین کے مرکز کے نام کو امام باڑے سے تبدیلی کر کے امام بارگاہ اور حسینیہ کر دیا۔ اس نام کی وسعت اور ہندوستانیت کو ختم کر کے عربیت اور فارسیت لادی۔ اور اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ ایسا نہ تھا کہ صوفیاء عربی و فارسی نہ جانتے تھے۔ انہوں نے اس کا نام امام باڑہ بڑی غور و فکر کے بعد رکھا تھا۔

اورنگزیب نے ۱۶۹۴ء میں علماء صوفیاء اور سادات کو دی ہوئی مدد معاش کو موروثی زمینداری میں بدل دیا تھا جس کے نتیجے میں علماء صوفیاء اور سادات کے خاندانوں سے تعلق رکھنے والے زمیندار بن گئے تھے' اور آہستہ آہستہ اپنے موروثوں کے راستے کو چھوڑ کر زمیندارانہ اقدار کے حامل ہو گئے۔ برٹش راج میں بھی مسلمان زمیندار بنے اور خاص طور سے سادات' سادات امروہہ' سادات جلالی' سادات سرسی' سادات مظفر سے تعلق رکھنے والے زیادہ تر سادات کو اس پر فخر حاصل ہے کہ ان کے اجداد زمیندار تھے۔ خود میرے ہی مورث سید شاہ خیرات علی کو ان کے قائم کردہ امام باڑے کے لئے نواب شجاع الدولہ نے معافی دی جس کو بعد میں زمینداری کی حیثیت میں منتقل کر دیا گیا۔ علماء نے اس زمیندارانہ نظام پر کچھ توجہ نہ دی اور انہوں نے بھی اپنے آپ کو اسی زمیندارانہ نظام میں ضم کر لیا۔ انہوں نے بھی نوابان اودھ سے بڑی بڑی جاگیریں حاصل کیں۔ بغیر اس

مسئلہ پر غور کئے ہوئے کہ یہ نوابی اور زمینداری ملکویت ہی کا ایک اہم جزو ہے اور خود ملکویت ایک غیر اسلامی ادارہ ہے' علماء اور سادات کا زمیندار بننا اتباع اہل بیت نہ تھا۔ امام حسینؑ کا احتجاج اسی ملوکانہ موروثی نظام کے خلاف تھا۔ اور اسی احتجاج کے نتیجے میں شہادت پائی۔ اس زمینداری کو اپنے خاندانوں میں محفوظ رکھنے کے لئے انہوں نے بھی جو وقف نامے وقف علی الاولاد کئے ان میں پسر اکبر کو اسی بنا پر متولی بنایا اور باقی تمام بیٹوں کو ان کے شرعی حقوق سے محروم کردیا گیا اور اسی طرح سے فقہ جعفری کی پیروی کے بجائے ملوکیت کے پیرو رہے اور اس کے بر خلاف وقف فی سبیل اللہ جائدادوں کو آپس میں تقسیم کرلیا جب کہ وقف فی سبیل اللہ جائداد زمینداری کے تحت نہیں تھی اور اسی وجہ سے قابل تقسیم بھی نہ تھی۔ اس کے نتیجے میں بہت سے امام باڑے وقف فی سبیل اللہ جائدادوں سے محروم ہوگئے۔ لیکن سادات بھی مودۃ القربیٰ کے پیرو تھے اور عزاداری امام حسینؑ ان کے عقیدہ کا ایک اہم جزو تھی۔ انہوں نے بڑے عالی شان امام باڑے تعمیر کرائے اور اس میں بیلجیم کے جھاڑ و فانوس آویزاں کئے اور بڑی شان سے عاشورہ محرم کی عزاداری منعقد کی اور اس طرح سے آہستہ آہستہ صوفیاء کی قائم کی ہوئی خلوص نیت اور سادگی پر منحصر عزاداری امام حسینؑ نے بھی اب زمیندارانہ شان و شوکت اختیار کرلی۔ اس زمیندارانہ طریقہ نظام عزاداری امام حسینؑ سے اس کی معنویت کو سخت نقصان پہونچا۔ اس لئے کہ دونوں اداروں' عزاداری اور زمینداری کا مزاج ایک دوسرے سے قطعاً مختلف تھا بلکہ یہ دونوں ادارے ایک دوسرے کی ضد تھے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اٹھارویں صدی عیسوی میں شیعہ علماء و مجتہدین نے قوم کی سیاسی اصلاح کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ اٹھارویں صدی عیسوی کے سماج کے مطالعے کے بعد یہ بات مزید واضح ہو جاتی ہے کہ شیعہ فرقے سے

تعلق رکھنے والے افراد میں مذہبی جذبہ تو تھا' وہ ایک اچھے حکمراں بھی تھے لیکن سیاسی شعور بالکل نہ تھا۔ اٹھارویں صدی سے لے کر موجودہ انقلاب ایران تک جو آیت اللہ خمینیؒ کی رہبری میں وجود میں آیا' ہندوستانی شیعہ علماء اور مجتہدین نے سیاسی اصلاح اور اس سے متعلق فکر پیدا کرنے کے سلسلے میں ایک کتاب بھی نہیں لکھی۔ ان علماء اور مجتہدین نے اپنے آپ کو نوابوں اور زمینداروں سے ہی وابستہ رکھا اور اسی نظام کا حصہ بن گئے۔ سیاسی اصلاح ان کی تقاریر کا بھی موضوع نہیں رہی' بلکہ ہندوستان اور بعد میں پاکستان کے زیادہ تر شیعہ علماء اور مجتہدین ایران کے موروثی شہنشاہ آریامہر سے مرعوب رہے۔ یہ تو اب ایران کے انقلاب کے بعد ہندوستانی اور پاکستانی شیعہ علماء نے اسلامی جمہوریہ کی بات کرنی شروع کی ہے۔ بچپن میں میرے کان اس اصطلاح سے قطعی ناآشنا رہے۔ میں نے تو اپنے وطن جلالی میں کبھی کسی عالم دین کو اس موضوع پر تقریر کرتے نہیں سنا۔ بالکل ایسی ہی حالت اہل سنت کی بھی ہے کہ ان کی بھی ایک کثیر تعداد سعودی عرب کے موروثی شاہوں سے متاثر ہے۔ ہاں اس دور میں اس مسئلہ پر ایک سنی عالم مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے قلم اٹھایا اور خلافت وملوکیت نام کی کتاب لکھی۔ میں اس کو ان کا ایک بڑا کارنامہ سمجھتا ہوں۔

صوفیاء نے امام باڑوں کے دروازے بلا تفریق مذہب وملت سب کے لئے کھول دئے تھے اور ایک کثیر تعداد مجالس ایام عاشورہ محرم میں شریک ہوتی۔ اب حسینیہ اور امام بارگاہ کے دروازے بھی سب کے لئے کھلے رہے لیکن ہندوؤں اور سنیوں نے ان مجالس میں شرکت کرنی قطعاً بند کردی۔ یہاں یہ بات واضح کرنا چاہوں گا کہ امام باڑے کے نام کو بڑے شہروں میں حسینیہ اور امام بارگاہ کردیا گیا۔ جیسے لکھنؤ میں امام باڑہ غفراں مآب کو اب

زیادہ تر حسینیہ غفراں مآب لکھا جانے لگا ہے یا پاکستان میں کراچی جیسے شہر میں امام باڑے امام بارگاہ کہلانے لگے لیکن ان قصبات میں جن کے مورث اعلیٰ صوفیائے کرام تھے اور انہوں نے ہی وہاں بنائے عزاداری محرم ڈالی تھی وہاں آج بھی ان کا نام باڑہ ہی ہے۔ خود میرے وطن جلالی میں کسی امام باڑے کو حسینیہ یا امام بارگاہ آج تک نہ تو کہا گیا اور نہ لکھا گیا۔ دوسرے ان قصبات میں عزاداری امام حسینؑ کو لے کر کسی بھی دور میں ہندو مسلم یا شیعہ سنی فساد نہیں ہوا۔ زمینداروں کے امام باڑوں میں سفید چاندنی کا فرش ہوتا۔ اشراف اس فرش پر بیٹھتے اور دیلی پردری کا فرش ہوتا جس پر مزدور وغیرہ بیٹھتے جو ان امام باڑوں میں نبیؐ کے نواسے کا پرسہ دینے کے لئے آتے تھے۔ صوفیاء نے ان مجالس کی بنیاد اسلامی مساوات اور اخوت پر قائم کی تھی۔ اب تفریق پیدا کر دی گئی۔ صوفیاء عزائے حسینؑ کے ذریعے تبلیغ اسلام کر رہے تھے اس لئے کہ اس ملوکانہ نظام نے مسلمانوں میں مساوات کو ختم کر دیا تھا۔ مساوات صرف مساجد تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ بقول اقبالؔ

ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

اس لئے کہ محمود غزنوی اور اس کا غلام ایاز صرف نماز کے وقت برابر اور باقی زندگی میں وہ بندہ اور محمود بندہ نواز تھے۔ وہاں مساوات نہ تھی۔ صوفیاء ان خانقاہوں اور امام باڑوں میں لوگوں کو ایک جگہ بٹھا کر مسلمانوں میں تفریق کو ختم کر کے اسلامی مساوات کی جڑوں کو مضبوط کر رہے تھے جس کو مسلمانوں کے موروثی ملوکانہ نظام نے کاٹ کر رکھ دیا تھا۔

عزاداری امام حسینؑ نے ایک موڑ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند اور خاتمہ زمینداری کے

بعد لیا جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ شیعہ علماء نے سیاسی رہنمائی یا اصلاح کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ علمائے دیوبند نے تو قیام پاکستان کی ببانگ دہل مخالفت کی لیکن شیعہ علماء خاموش رہے۔ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کا بٹوارہ ہو گیا۔ اب کیا کرنا ہے۔ کس طرف جانا ہے؟ علماء و مجتہدین کی طرف سے کوئی جواب اور نہ ہی اس کا کوئی حل۔ نتیجتاً شیعہ فرقے سے تعلق رکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد پاکستان چلی گئی اور آج وہ اس غلطی کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔ ہندوستان جیسے جمہوری ملک کو چھوڑ کر جانا صحیح فیصلہ نہ تھا۔ ان تمام حالات کا اثر عزاداری امام حسینؑ کے نظام پر بھی پڑا۔ بعض امام باڑے سونے ہو گئے اور ان کی عمارتیں شکستہ ہو گئیں۔ بعض امام باڑوں پر کسٹوڈین کا قبضہ ہو گیا۔ دوسرا مسئلہ خاتمہ زمینداری نے پیدا کر دیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ زمیندارانہ دور کی عزاداری کا نظام کیسے چلے گا، اس لئے کہ صوفیاء کی قائم کی ہوئی خلوص دل اور سادگی پر مبنی روایات کو تو زمیندارانہ کروفر نے بہت پہلے ہی ختم کر دیا تھا۔ صوفیاء نے عزاداری امام حسینؑ کو مزدور فن کار اور کاریگروں اور ان کے جذبہ کے ساتھ جوڑ دیا تھا اور انہوں نے اپنے آپ کو اس نظام میں ضم کر لیا تھا۔ زمیندارانہ دور کی عزاداری دادودہش اور بے گار پر مبنی تھی۔ خاتمہ زمینداری کے بعد معاشی بحران شروع ہوا تو نہ تو دادودہش رہی اور نہ ہی بے گار لینے کی قوت۔ اب مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ کہار کہاں سے ملیں گے۔ مراثیوں کو کہاں سے رقم دی جائے گی، مزدوروں کو مزدوری کون دے گا وغیرہ وغیرہ اس معاشی بدحالی کے دور میں کچھ دنوں تک تو دکھاوے پر پرانے نظام کو گھسیٹنے کی کوشش کی گئی لیکن آخر میں سادگی پر اتر آئے۔ لیکن عزاداری امام حسینؑ حد درجہ محدود ہو چکی تھی۔ اس کے بعد ثقافتی بحران کا دور شروع ہوا۔ زبان و ادب کا مسئلہ پیدا ہوا۔ اردو کے مقابلے میں دوسری زبانوں کو معاش سے جوڑ دیا گیا لہٰذا زبان کی

مجبوریاں پیدا ہوئیں۔ نوحہ۔ جو اپنے معنی کے اعتبار سے نوحہ ہی ہونا چاہئے اس کی طرز کو گانے کی طرز سے ملادیا گیا۔ پہلے نوحہ پڑھنے سے جو حزن وملال پیدا ہوتا تھا اس کی جگہ فرحت کا احساس ہونے لگا۔ ظاہر ہے کہ جب نوحے کے معنی ہی نہیں جانتے تو اس کی روح کو کیسے سمجھ سکتے ہیں۔ نئی نسل اور آنے والی نسلیں اس زبان وادب سے قطعی طور پر ناواقف ہیں کہ جس میں عزاداری امام حسین سے متعلق ذخیرہ موجود ہیں۔

اب اکیسویں صدی پورے نظام زندگی کے لئے ایک چیلنج لے کر آرہی ہے۔ جہاں اور چیزیں متاثر ہوں گی وہاں نظام عزاداری بھی متاثر ہوگا۔ اس میں سب سے بڑا مسئلہ وقت کا ہوگا؟ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ علماء' مجتہدین اور دانشور' اس آنے والی زندگی کے سوالات کے بارے میں غور وفکر کریں اور باقاعدہ طور پر اس ایجنڈے پر قومی کانفرنس منعقد کریں تاکہ ان مسائل کو حل کرنے کی کوشش ابھی سے کی جاسکے۔ اس طرح کا رویہ نہ اپنائیں جو ہم نے تقسیم ہند اور خاتمہ زمینداری کے مسائل سے متعلق اپنایا تھا۔ اس لئے کہ ابھی وہ نسل موجود ہے جس نے تقسیم ہند اور خاتمہ زمینداری کے بعد کے معاشی بحران کو دیکھا تھا اور اس سے پیدا ہونے والے مختلف مسائل کی وجہ سے صعوبتیں برداشت کی تھیں۔

ظاہر ہے کہ مذہبی عقیدہ تو اپنی جگہ قائم رہتا ہے۔ عزاداری امام حسین تو ہمیشہ قائم ودائم رہیگی۔ لیکن جب کوئی بھی مذہبی عقیدہ کسی سماج کا حصہ بن جاتا ہے تو تاریخ اور سماجیات کے طالب علم کی حیثیت سے ہم اس کے مختلف مراحل ابتداء' فروغ اور اس کے انحطاط کا مطالعہ ان تینوں حیثیتوں میں کرتے ہیں۔ ہندوستان میں عزاداری امام حسین کا قیام اور اس کا فروغ صوفیائے کرام کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔ اور جس طرح سے صوفیاء

نے عزاداری امام حسینؑ کو ہندوستانی سماج میں وسعت بخشی اس حد تک اسے ہندوستانی سماج و ثقافت کا ایک جزو بنادیا۔ جس میں ہندو اور مسلمان خلوص دل سے شریک ہوئے۔ مسلمان تو رسولؐ کے پیرو تھے اور محبت اہل بیت کو اجر رسالت سمجھ کر عزاداری میں شامل ہوتے لیکن ہندو تو اپنے دھرم پر قائم رہتے ہوئے حسینؑ کے پجاری بن گئے یہ ان صوفیاء کی کرامت ہی کہی جاسکتی ہے۔ صوفی تحریک کمزور ہوئی' علماء کے درمیان مناظرہ شروع ہوا' عزاداری امام حسینؑ کو زمیندارانہ نظام کا حصہ بنادیا گیا' ہندو مسلمانوں اور شیعہ اور سنیوں میں اختلافات پیدا ہوئے اور اس سب کا فائدہ برٹش حکمرانوں نے اٹھایا۔ ان تمام وجوہ سے عزاداری امام حسینؑ کو سخت نقصان پہنچا۔ آج شیعوں میں بھی تفریق پیدا ہو گئی۔ یہ سیدوں کا امام باڑہ ہے' یہ جولاہوں کا امام باڑہ ہے اور یہ فقیروں کا امام باڑہ ہے۔ اس سے عزائے حسینؑ کو مزید نقصان پہنچ رہا ہے جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے پیرو رہیں گے اس وقت تک عزاداری امام حسینؑ قائم رہے گی۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ علماء اس عزاداری امام حسینؑ میں صوفیاء کی طرح اسلامی مساوات کے اصول کو قائم کریں تاکہ جملہ مسائل حل ہو سکیں۔

☆☆☆

حوالہ جات:

۱۔ میر سید علی ہمدانی' مودۃ القربیٰ' قلمی نسخہ' کتب خانہ سید شاہ خیرات علی' جلالی ضلع علی گڑھ۔

تفصیل کے لئے حکیم سید محمد کمال الدین حسینؔ' صاحب مودۃ القربیٰ

۲۔ حکیم سید محمد کمال الدین حسینؔ' ذخیرہ جلالی کے چار اہم مخطوطات' خدابخش

جرنل ۶۹-۷۴، صفحہ ۱۲۷

۳ سید نوراللہ شوستری 'مجالس المومنین ' قلمی نسخہ انڈیا آفس کلکشن 'لندن 'اس مخطوطے کے آخر میں قاضی سید نوراللہ شوستری کی اپنے قلم سے تحریر موجود ہے۔

۴ حسن علی کربلائی 'تحفة العوام' یہ سال بھر کے اعمال پر مشتمل کتاب ہے۔ کوئی گھر اہل تشیع شاید ہی ایسا ہو کہ جس میں یہ کتاب موجود نہ ہو۔

۵۔ عزاداری امام حسین سے متعلق اس میں کوئی باب نہیں اور نہ ہی عزاداری امام حسین سے متعلق رسومات کا اس میں کہیں ذکر۔

۶۔ حضرت قطب الدین بختیار کاکی کا تعلق صوفیاء کے چشتی سلسلے سے تھا۔ وہ تیرھویں صدی عیسوی میں حضرت معین الدین چشتی کے خلیفہ تھے۔ ان کی درگاہ دہلی میں مہرولی میں قطب مینار کے نزدیک واقع ہے۔

میر سید علی ہمدانی کے بزرگوں میں سے میر کمال الدین ہمدانی' مغل بادشاہ ہمایوں کے عہد میں سولہویں صدی عیسوی میں کشمیر سے جلالی تشریف لائے اور یہیں سکونت اختیار کی۔ سادات جلالی انہیں کی نسل سے ہیں۔ جلالی میں عزاداری امام حسین کا قیام اسی دور میں وجود میں آیا۔ نواب شجاع الدولہ نے اسی خاندان سے تعلق رکھنے والے ایک بزرگ سید شاہ خیرات علی کو عزاداری امام حسین کے مصارف کے لئے پانچ گاؤں ضلع ایٹہ میں دیئے۔ جلالی کی عزاداری میں جن چیزوں میں صوفیاء کی جھلک ملتی ہے وہ ہیں امام باڑے' مجلس خوانی' ہندو اور مسلمانوں کا عزاداری امام حسین میں شریک ہونا۔ جلالی میں عزائے حسین کو لے کر آج تک کوئی بھی جھگڑا نہیں ہوا جبکہ جلالی سے انیس کلو میٹر دوری پر علی گڑھ میں اکثر عزائے حسین کو لے کر مسئلہ بنا۔ جلوس پر پابندی لگی اور کچھ برسوں تک جلوس نہ نکل سکا۔

۷۔ بیسویں صدی میں جرمنی کے ماہر تعلیم کرسن ٹیر نے تعلیم کر حرفے سے جوڑنے کی سب سے پہلے تھیوری پیش کی۔ ہندوستان میں گاندھی جی نے آزادی کی تحریک میں بھی اس کا

استعمال کیا۔ڈاکٹر ذاکر حسین نے اس کو بنیادی تعلیم کے نصاب میں شامل کر کے قومی تعلیم کا ایک منصوبہ ۱۹۳۷ء میں واردھا میں پیش کیا۔

۸۔ درگاہ علی خاں۔مرقعہ دھلی۔فارسی مخطوطہ'سالار جنگ میوزیم'حیدر آباد'ایف اے۔ بی ۵۶'۸اور ۵۸۔

۹۔ ضیاء الدین برنی'تاریخ فیروز شاھی'لاہور ۱۹۸۳'صفحہ ۴۶

۱۰۔ سید ابو الاعلیٰ مودودی' خلافت وملوکیت' دہلی

۱۱۔ اقتدار عالم خاں' امرائے عھد اکبر اور اس کی مذھبی پالیسی کا ارتقاء صفحات ۳۲-۳۶

۱۲۔ قاضی جاوید' ھندی مسلم تھذیب'لاہور ۱۹۹۵'صفحہ ۲۴

۱۳۔ عبد القادر بدایونی منتخب التواریخ'جلد سوم'صفحات ۱۳۷-۳۸

۱۴۔ سید محمد عزیز الدین حسین: قاضی سید نور الله شوستری ' ایک سوانحی خاکہ' اسلام ان دی چینجنگ ورلڈ'جلد ۲'۱۹۹۳'صفحات ۲۹-۳۱

۱۵۔ اورنگزیب' احکام عالمگیری'لاہور'۱۹۹۳ء'صفحات ۱۳۴-۱۳۶

۱۶۔ ایضاً صفحہ ۱۳۴

۱۷۔ ایضاً صفحہ ۱۳۵

۱۸۔ محمد صادق طبقات عالمگیری'مخطوطہ نیشنل میوزیم'نئی دہلی'ایف ۱۸۵ ایف

۱۹۔ فرزند علی مونگیری'ملخص التواریخ'مخطوطہ نیشنل میوزیم'نئی دہلی'ایف ۳۸ اے۔

۲۰۔ قاضی جاوید'صفحہ ۲۴۰

۲۱۔ ایضاً ۲۴۱

۲۲۔ شیخ محمد اکرام'رودکوثر'لاہور'۱۹۸۲ء صفحہ ۵۳۴

۲۳۔ قاضی جاوید' صفحہ ۲۴۱

۲۴۔ ایضاً صفحہ ۲۴۳

۲۵۔ ایضاً ۲۴۲

۲۶۔ شیخ محمد اکرام ۵۷۵

۲۷۔ ڈاکٹر ثریا ڈار' شاہ عبد العزیز اور ان کی علمی خدمات 'لاہور' ۱۹۹۱ء
صفحہ ۱۲۴

۲۸۔ ایضاً

۲۹۔ شاہ عبدالعزیز تحفہ اثناء عشریہ 'صفحات ۳-۴

۳۰۔ ڈاکٹر ثریا ڈار' صفحہ ۱۲۲

۳۱۔ ایضاً ۱۲۲

۳۲۔ ایضاً ۱۲۲

۳۳۔ ایضاً ۱۲۲

۳۴۔ مولانا محمد تقی۔مرأت الاحوال جہاں نما' فارسی مخطوطہ' انڈیا آفس کلکشن' لندن'
ایف ۱۱۸ اے۔

☆☆☆☆☆

فاطمہؑ کے ماسوا

دبیرؔ سیتاپوری

ایک نورانی تصور انتہا کے ماسواء — فاطمہ زہرا کی منزل ماسوا کے ماسوا
فاطمہ کو پا کے ہے کتنی رسالت مطمئن — کیا چمن کو چاہئے ٹھنڈی ہوا کے ماسوا
کفوِ زہراؑ اور کوئی ہوسکے ممکن نہیں — کون ہے مولود کعبہ، مرتضیٰ کے ماسوا
کس کی بیٹی، کس کی ماں ہے باخبر سب ہیں مگر — رتبہ داں کوئی نہیں اہل کساء کے ماسوا
کہدیا تو کہدیا جنت سے کپڑے آئیں گے — کب ہے مرضیٔ خدا تیری رضا کے ماسوا
اور بھی تھیں بیٹیاں مرسل کی چلئے ٹھیک ہے — ہے کوئی امّ ابیہا، فاطمہ کے ماسوا؟
شکوہ نافرمانیوں کا کس لئے اولاد سے — کیا دیا ماؤں نے قرآں کی ہوا کے ماسوا
مجلس وماتم، غم بے چادری، فکر نجات — سب ہمارے گھر میں ہے شرم وحیا کے ماسوا
منحرف ان سے کنیزیں ان کی مثل قوم نوحؑ — کوئی کشتی پر نہیں ہے ناخدا کے ماسوا
نوحؑ ویونسؑ آؤ دیکھو اس گھرانے کا مزاج — ہر طرح کی بات لب پر، بددعا کے ماسوا
انبیاءؑ میں سب سے افضل باپ اٹھے تعظیم کو — تھی، نہ ہوگی ایسی بیٹی، فاطمہ کے ماسوا
عمر بھر فاقے کئے مشکل کشا شوہر کے ساتھ — کچھ نہیں مریم، تمہاری ابتدا کے ماسوا
تم کہاں تھے، اچھا مسجد میں تھے، بولو کیا سنا — کون ماں پوچھے حسنؑ کی والدہ کے ماسوا

برتری کی دعویداری گنگ ہوجائے دبیرؔ
کس کے گھر اترا ہے تارا، فاطمہ کے ماسوا

مسئلہ فلسطین

اور ملت اسلامیہ عالم

از: ڈاکٹر اختر مہدی

گذشتہ نصف صدی سے بھی کچھ زیادہ عرصے سے پوری دنیائے بشریت میں ہلچل مچی ہوئی ہے کہ مسئلہ فلسطین کا حل لازمی ہے لیکن عالمی ابلاغ عامہ نے بڑی طاقتوں کے دباؤ میں حقائق کو کچھ اس طرح توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے کہ اکثر لوگوں کو اس بات کا علم ہی نہیں کہ آخر اصل مسئلہ کیا ہے اور جب مسئلہ مبہم ہو جائے تو واضح اور منصفانہ و عادلانہ حل کی امید ہی نہیں کی جاسکتی۔

درحقیقت سرزمین فلسطین صدیوں سے عربوں کا وطن ہے۔ ان عرب باشندوں میں مسلمان یہودی اور عیسائی مذاہب کی پیروی کرنے والے ۱۹۴۷ء تک آپسی میل جول کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے۔ تاریخی اعتبار سے سلطان صلاح الدین ایوبی نے فلسطین کو ۱۱۹۲ء میں حملہ آوروں کے چنگل سے نجات دلائی اور اس کے بعد ۱۹۱۷ء تک یہ ملک سلطنت عثمانیہ کا اٹوٹ حصہ بنا رہا۔ اس وقت برطانیہ دنیا کی اکلوتی بڑی طاقت تھا جس نے دنیا کے بہت بڑے علاقے کو اپنے نو آبادیاتی نظام کا حصہ بنا رکھا تھا اور یہ کہا جاتا تھا کہ سلطنت برطانیہ میں سورج ڈوبتا ہی نہیں ہے۔ بہر حال ۱۹۱۷ء میں برطانیہ سرزمین فلسطین میں ایک یہودی ملک کی تشکیل کا عہد کرتا ہے جس کا کوئی منطقی اور قانونی جواز نظر نہیں آتا کیونکہ اس زمانے میں اس سرزمین میں ۹۸ فیصد مسلمان اور صرف ۲ فیصد یہودی آباد تھے لیکن

طاقت کے نشہ میں ڈوبے ہوئے برطانوی وزیر خارجہ آرتھر بلفور نے برطانوی منصوبے کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ ’’برطانیہ کا مصمم ارادہ ہے کہ سرزمین فلسطین میں یہودی ملک کی تشکیل کرے‘‘ واضح رہے کہ پہلی عالمی جنگ کے دوران جب اسلامی علاقوں پر اتحادی جماعت کا اثرورسوخ بڑھا تو برطانوی فوج نے فلسطین پر قبضہ کرلیا کیونکہ اس وقت ترکی درحقیقت جرمنی کے ساتھ تھا۔ عالمی جنگ کے دوران ترکی کے خلاف برسرپیکار حکومتوں نے اس برطانوی منصوبے کا بھرپور استقبال کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے برطانوی اقتدار کی حمایت وسرپرستی میں ۱۹۲۰ء سے فلسطین میں دنیا کے مختلف ملکوں سے یہودیوں کی آمد کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوجاتا ہے اور دنیا کا ہر ملک خوشی خوشی یہودیوں کو فلسطین کی طرف ڈھکیلنے لگتا ہے کیونکہ برطانوی حکومت کی خوشنودی کے ساتھ ہی ساتھ اس ملک کو یہودیوں کی اقتصادی لوٹ کھسوٹ اور استحصالی کرتوتوں سے نجات بھی مل جاتی تھی۔ فلسطین میں یہودیوں کی نوآبادکاری کا بنیادی مقصد اس ملک میں یہودیوں اور مسلمانوں کے درمیان خوفناک خانہ جنگی کی شروعات تھی تاکہ برطانیہ کو اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا بہانہ ہاتھ آجائے کیونکہ یہ برطانوی سامراج کا آزمودہ نسخہ رہا ہے کہ پھوٹ ڈالو اور راج کرو اور سرزمین ہندوستان میں وہ اپنے اس اسلحے سے عظیم الشان کامیابی حاصل کرچکا تھا۔

بہرحال منصوبہ بلفور کے اعلان کے بعد برطانوی اقتدار کے سایہ میں دنیا کے کونے کونے سے یہودیوں کو فلسطین میں آباد کیا جانے لگا اور وہاں کے اصل اور حقیقی باشندوں کو مرعوب کرنے کے لئے سمیناروں اور کانفرنسوں کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا ان کانفرنسوں کے ذریعہ فلسطینی مسلمانوں کو یہ پیغام دیا جاتا تھا کہ فلسطین یہودیوں کا ملک ہے۔ مسلمانوں کو ازخود یہاں سے چلا جانا چاہئے ورنہ انہیں قتل وخونریزی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

اس قسم کی پہلی کانفرنس ۱۹۱۹ء میں منعقد ہوئی تھی۔ دوسری طرف بیرونی یہودیوں کی آمد کی وجہ سے فلسطین میں یہودیوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ صرف ۱۹۳۵ء میں بیرونی ممالک کے ۶۰۰۰۰ یہودیوں کو سرزمین فلسطین میں آباد کیا گیا تھا۔ دو سال کی مختصر مدت کے دوران سرزمین فلسطین میں یہودیوں کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ برطانوی حکومت کی تشکیل شدہ بل کمیٹی اپنی رپورٹ میں یہ سفارش پیش کرتی ہے کہ فلسطین کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک حصہ مسلمانوں اور دوسرا حصہ یہودیوں کے سپرد کر دیا جانا چاہئے اور ۱۹۳۹ء میں برطانوی حکومت کی طرف سے یہودیوں کو یہ خصوصی مراعات حاصل ہو جاتی ہے کہ آئندہ پانچ برسوں کے دوران وہ لوگ ہر سال دس ہزار بیرونی ممالک کے یہودیوں کو سرزمین فلسطین میں آباد کر سکتے ہیں اور ۱۹۴۸ء میں برطانوی حکومت فلسطین سے اپنی فوجوں کی واپسی کے اعلان کے ساتھ ہی ساتھ سرزمین فلسطین میں ایک نئے ملک اسرائیل کی تشکیل کو عملی جامہ پہنانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ واضح رہے کہ پوری دنیا میں اسرائیل وہ تنہا ملک ہے جو دنیا کے نقشے پر پہلے ظاہر ہوا اور بعد میں اس کا جغرافیائی ڈھانچہ تیار کیا گیا۔

اس مختصر مگر لازمی تاریخی پس منظر کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ برطانیہ نے یہودیوں کے وطن کی حیثیت سے فلسطین ہی کا انتخاب کیوں کیا؟ مسئلہ فلسطین کو ایک علاقائی اور قومی مسئلہ سمجھنے کے بجائے اسلامی مسئلہ کیوں قرار دیا جائے؟ مسئلہ فلسطین کے سلسلہ میں دنیا کے اہم اسلامی ممالک اور عالمی مسلمانوں کا رد عمل کیا رہا؟ فلسطین جدوجہد کی ناکامی کا راز کیا ہے؟ اور سردست فلسطین کی نجات کے لئے کیا کیا جانا چاہئے ار عالمی انسانی برادری بالخصوص ملت اسلامیہ عالم اس سلسلے میں کیا کردار ادا کر سکتی ہے؟

پہلے اور بنیادی سوال کے جواب میں اس مسلم الثبوت حقیقت کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے ہے کہ مذاہب کی تاریخ میں اسلام ایک نوجوان مذہب ہے کیونکہ یہودیت اور عیسائیت کے مقابلے میں اسلام کا ظہور بعد میں ہوا ہے اور اس کی ظاہری عمر کل ۱۴۲۲ سال کی ہے لیکن اپنے آفاقی اور انسانیت دوست پیغامات کی وجہ سے آج دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جہاں سے اشهد ان محمّد رسول اللّٰه کی آواز بلند نہ ہوتی ہو اور اس پسندیدۂ خدا دین مبین کی پیروی کرنے والے موجود نہ ہوں بلکہ یہ کہنا زیادہ حق بجانب معلوم ہوتا ہے کہ ۲۴ گھنٹوں میں کوئی ایک لمحہ بھی ایسا نہیں ہے جب یہ الٰہی آواز عالمی فضا کے کسی گوشے میں نہ گونج رہی ہو۔ مذہب اسلام کی یہ غیر معمولی مقبولیت دنیا کے ایک گوشے میں محدود عیسائیت و یہودیت کو قطعی اچھی نہ لگی لہٰذا ان لوگوں نے ایک منصوبہ بند پروگرام کے تحت فلسطین میں یہودی ملک کی تشکیل کا فیصلہ کیا۔ ان لوگوں کو یہ اندازہ تھا کہ مسلمانوں کا قبلۂ اول یعنی بیت المقدس اسی سرزمین میں واقع ہے اور قرآن شاہد ہے۔

سبحان الذی اسریٰ بعبده لیلا من المسجد الحرام الی المسجد الاقصی۔“

کہ ہمارے پیغمبر جس جگہ سے معراج کیلئے تشریف لے گئے تھے وہ اسی سرزمین میں واقع ہے۔ اس کے علاوہ ایسی دوسری عبادت گاہیں بھی موجود ہیں جن کی وجہ سے فلسطین دنیا کے ایک ارب مسلمانوں کا دھڑکتا ہوا دل بن گیا ہے اور اسلام کے قلب پر قبضہ جمانے کے بعد مسلمانوں کو راہ مستقیم سے منحرف کر دینے میں اسرائیل کو کوئی دشواری نہ ہوگی۔ اس کی اسی حکمت عملی کے بموجب ہم پورے وثوق و مکمل اعتماد کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں فلسطین ایک علاقائی یا محض عرب قوم کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ خالص اسلامی مسئلہ ہے اور اس کا دنیا کے تمام مسلمانوں سے گہرا تعلق ہے اور برطانیہ نے یہودیوں کے وطن کی حیثیت سے اس

سر زمین کا انتخاب اسی لئے کیا تھا کہ ملت اسلامیہ کو ذلت ورسوائی کا شکار بنایا جاسکے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ۱۹۷۹ء میں مصر واسرائیل کی کوشش اور امریکی حمایت وسرپرستی میں جب کیمپ ڈیوڈ معاہدہ پر دستخط کی بات آئی تو اس کام کیلئے اسپین کے دارالحکومت میڈرڈ کا انتخاب کیا گیا تاکہ مسلمانوں کے گلے میں ذلت ورسوائی کا یہ طوق اسی شہر میں ڈالا جائے جو ایک وقت میں اسلام اور مسلمانوں کی عظمت کا منارہ رہا ہے۔ بہر حال یہ بات ثابت ہو گئی کہ مسئلہ فلسطین ایک اسلامی مسئلہ ہے جس کا دنیا بھر کے مسلمانوں سے گہرا تعلق ہے۔

اب یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ فلسطین پر اس غاصبانہ تسلط کے خلاف اسلامی ممالک کا رد عمل کیا رہا اور فلسطینی جدو جہد کو ایک طویل عرصے تک ناکامی کا منہ کیوں دیکھنا پڑا۔ واضح رہے کہ ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کی تشکیل کے بعد اسلامی ممالک کی حکومتوں کی طرف سے اکثر بیانات جاری ہوتے تھے جن میں اسرائیل کی مذمت اور فلسطینیوں کی حمایت کا ذکر ہوا کرتا تھا اور یہ سلسلہ ۱۹۶۳ء تک جاری رہا اور اسی دوران آزادی فلسطین تحریک کے نامور مجاہد حسن البناء کی شہادت بھی واقع ہوئی۔ اس کے بعد ۱۹۶۷ء میں عربوں اور اسرائیلیوں کے درمیان خوفناک جنگ ہوتی ہے جس میں ہزاروں فرزندان توحید شہادت سے ہم آغوش ہو جاتے ہیں اور فلسطینی مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد آوارہ وطنی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے اور اسلامی ممالک کے سربراہ صدقہ وزکوٰۃ کی رقم سے ان کی کفالت کو نجات دنیوی واخروی کا ذریعہ بنالیتے ہیں اور بعض اسلامی ملک جیسے ایران اور جارڈن وغیرہ تو اسرائیل کی حمایت کرنے میں بھی شرم نہیں محسوس کرتے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ کے دوران اسرائیلی جنگی جہاز ایران کے فوجی ہوائی اڈوں سے اڑان بھر کر عرب مسلمانوں پر بمباری کرتے تھے اور اسی دوران

اردن میں فلسطین پناہ گزینوں کا وحشیانہ قتل عام دنیائے بشریت کو لرزہ براندازم کر دینے کے لئے کافی ہے غرضکہ فقط ۱۹۶۷ء میں ہی نہیں بلکہ ۷۳-۱۹۷۰ء کے دوران دوسری عرب اسرائیل جنگ میں بھی عربوں کو شرمناک شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ شکست کے بعد شکست کا بنیادی راز یہ تھا کہ آزادی فلسطین تحریک کی بنیاد قومیت پر قائم تھی اور اسلامی ممالک کے حکمراں خدا ورسول اور اپنے عوام پر بھروسہ کرنے کے بجائے امریکہ پر بھروسہ کرتے تھے۔ اور ہمہ وقت امریکہ کی خشنودی حاصل کرنے میں لگے رہتے تھے۔ اگر ابتدائی مرحلہ میں ہی اس تحریک آزادی فلسطین کو اسلامی بنیادوں پر مستحکم کیا گیا ہوتا تو یہ شرمناک ناکامی یقیناً کامیابی میں تبدیل ہو جاتی۔

واضح رہے کہ امام خمینیؒ نے اپنی اسلامی تحریک کے آغاز میں شاہی حکومت کی تین اسلام دشمن کرتوتوں کا ذکر کیا تھا جس میں ایرانی حکومت کی اسرائیل دوستی بھی شامل ہے۔ انہوں نے ۱۹۶۴ء میں اپنے تحریری بیان میں یہ اعلان فرمایا تھا کہ ''اسرائیل اسلامی ملکوں کے خلاف جنگ و نبرد آزمائی میں سرگرم ہے... میں عالم اسلام کو اس اہم خطرے کی طرف برابر متوجہ کرتا چلا آرہا ہوں'' شاہی حکومت اور اسرائیل کے درمیان دوستانہ تعلقات پر اپنا شدید ردعمل ظاہر کرتے ہوئے وہ اعلان کرتے ہیں۔ ''میں مشرق و مغرب کے تمام مسلمانوں اور اسلامی ملکوں سے یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ شیعہ مسلمان اسرائیل اور اسرائیلی ایجنٹوں کے مخالف ہیں اور اسرائیلی حکومت کو سرکاری طور پر تسلیم کرنے والے ملکوں کی بھرپور مذمت بھی کرتے ہیں۔'' جلاوطنی کے زمانہ میں لکھی گئی اپنی کتاب ''تحریر الوسیلہ'' میں وہ اسلامی ملکوں کے نام یہ فتویٰ صادر کرتے ہیں کہ وہ ایسے تمام ملکوں سے اپنے سفارتی اور تجارتی تعلقات منقطع کرلیں جو اسلامی مفاد کے خلاف اسلام دشمن حکومت

کے ساتھ کوئی معاہدہ کرتے ہیں۔"

امام خمینیؒ کو اس بات کا بخوبی اندازہ تھا کہ شاہی حکومت اسرائیل کی حمایت کر رہی ہے۔ پھر بھی انہوں نے اس وقت کے وزیر اعظم کے نام ایک خط ارسال فرمایا جس میں بڑی وضاحت کے ساتھ یہ لکھا کہ "اسرائیل کے ساتھ ہرگز کوئی معاہدہ نہ کرنا کیونکہ اسرائیل دشمن اسلام ہے اور اسرائیلی حکومت نے دس لاکھ سے زیادہ فلسطینی مسلمانوں کو آوارہ وطن کر دیا ہے لہٰذا اسرائیل کے لئے مسلم بازاروں کا دروازہ ہرگز نہ کھولنا۔" ۱۹۶۵ء میں سرزمین نجف اشرف سے مسلمانوں کی فکر کو جھنجھوڑتے ہوئے یہ سوال کرتے ہیں کہ "آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ مٹھی بھر لٹیرے اور خانہ بدوش یہودی دس لاکھ سے زیادہ فلسطینی مسلمانوں کو ان کے وطن سے باہر نکال دیں۔ کیا اس کا بنیادی سبب یہ نہیں کہ ہم لوگ راہ حق سے منحرف ہو گئے ہیں اور وہ اپنے باطل موقف پر اٹل اور ثابت قدم ہیں۔" پس ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ ہو یا ۱۹۶۹ء میں مسجد الاقصیٰ کو نذر آتش کرنے کا واقعہ اور اسی طرح خواہ وہ اکتوبر ۱۹۷۳ء کی جنگ ہو یا ۱۹۷۷ء میں سادات کا سفر بیت المقدس یا پھر ۱۹۷۹ء میں ہونے والا شرمناک معاہدہ کیمپ ڈیوڈ ہر مرحلہ میں انہوں نے اسلام دشمن سازشوں کے خلاف اپنے حق پسندانہ موقف کا باقاعدہ اعلان کیا اور ساری دنیا پر یہ ثابت کر دیا کہ جو لوگ خدا سے ڈرتے ہیں وہ دنیاوی طاقتوں کو خاطر میں نہیں لاتے۔ چنانچہ فروری ۱۹۷۹ء میں اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد جب وہ ایران تشریف لائے تو انہوں نے اسرائیلی سفارت خانے کی عمارت میں فلسطین مجاہدین کا دفتر قائم کروایا اور ملت اسلامیہ عالم سے یہ مطالبہ کیا کہ دنیائے بشریت بالخصوص ساری دنیا کے مسلمانوں کو فلسطینی مظلوموں کے دردناک حالات سے باخبر کرنے کے لئے رمضان المبارک کے

آخری جمعہ کو "عالمی یوم قدس" منانے کا اہتمام کیا جائے تاکہ اسرائیلی جلادوں کو یہ پتہ چل سکے کہ جن فلسطینی مسلمانوں کا قتل عام کیا جارہا ہے وہ عالمی اسلامی برادری کا اہم حصہ ہیں اور بیگناہوں کا یہ خون رائگاں نہیں جائے گا چنانچہ ایسا ہی ہوا چنانچہ رمضان المبارک کے مہینے میں عالمی فضا "اسرائیل مردہ باد" کے فلک شگاف نعروں سے گونج اٹھی یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے اور فلسطین کی حقیقی آزادی تک جاری رہے گا۔ ۱۹۸۷ء میں جب اسرائیلی مظالم کے خلاف فلسطینی مجاہدوں نے "انتفاضہ کے سایہ میں اپنی مسلحانہ جوجدوجہد شروع کی تو امام خمینیؒ نے ان کی اعلانیہ اور بھرپور حمایت کی اور فقط ایرانی حکومت ہی نہیں بلکہ عوام سے بھی یہ اپیل کی کہ وہ فلسطینی مجاہدوں کی حوصلہ افزائی کریں۔ چنانچہ ایران کا بچہ بچہ اپنے قائد عظیم الشان کی سفارش پر عمل کرتے ہوئے آج بھی فلسطینی مجاہدوں کی بھرپور حمایت کررہاہے۔ اور سرزمین لبنان میں انتفاضہ کی عظیم الشان کامیابی نے یہ ثابت کردیا ہے کہ خدا کی ذات پر اپنے اٹل اعتماد کی وجہ سے ہی سنگ بردار فلسطینی اور لبنانی مجاہدوں نے بمباری اور گولہ باری کرنے والی طاقتور اسرائیلی فوج کو جنوبی لبنان کی سرحدوں سے باہر نکال دیا اور آج فلسطین کی آزادی کیلئے ہمہ تن سرگرم عمل ہیں۔

۲۰ راکتوبر ۲۰۰۰ء کو تہران میں تقریباً ایک لاکھ دس ہزار رضاکار ایرانی مجاہدوں نے عظیم ریلی کا اہتمام کرتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ وہ مسلح فلسطین مجاہدوں کی حمایت کے لئے ہمہ تن آمادہ ہیں اور ۲۴ مئی ۲۰۰۱ء کو تہران میں منعقد فلسطینی انتفاضہ حمایت کانفرنس کے دوران ایران کے مذہبی رہنما آیت اللہ خامنہ ای نے یہ اعلان فرمایا کہ ایران فلسطینی مجاہدوں کے ساتھ ہے اور اسرائیلی مظالم اور امریکی اسلام دشمن سازشوں کی بھرپور مذمت کرتاہے۔ اس عالمی کانفرنس میں موجود اسلامی جمہوریہ ایران کے صدر حجت

الاسلام محمد خاتمی نے اپنی تقریر کے دوران آیت اللہ خامنہ ای کے بیان کی اعلانیہ حمایت فرمائی۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ امام خمینیؒ نے جس اسلامی موقف کا اعلان کیا تھا ایرانی حکومت اور عوام آج بھی اسکے پیرو ہیں۔

درحقیقت سرزمین فلسطین میں اسرائیل نامی ملک کی تشکیل کے بعد جلاد صفت صہیونی حکومت کی ظالمانہ راہ و روش کے خلاف انقلابی سرگرمیوں کا سلسلہ جاری ہے لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ اس مجاہدانہ نقل و حرکت کی بنیاد قومیت تھی اور دنیاوالوں کو یہ بتایا جارہا تھا کہ عربوں اور یہودیوں کے درمیان بہت پرانی دشمنی چلی آرہی ہے اور اسی وجہ سے یہ لوگ آئے دن برسرپیکار رہا کرتے ہیں۔ چنانچہ اسی پروپگنڈہ کے سایہ میں فسلطینی مظلوم گذشتہ چار پانچ دہاہیوں سے دربدری کی زندگی بسر کرتے چلے آرہے ہیں۔ واضح رہے کہ عرب قومیت کے نام پر لڑی جانے والی ہر جنگ میں فلسطینی مظلوموں کو باربار منہ کی کھانی پڑی کیونکہ اکثر حکومتیں امریکی دباؤ کے سایہ میں خاموش تماشائی بنی رہ گئیں اور اسلام دشمن طاقتیں اپنا اثر و رسوخ قائم کرنے اور بڑھانے میں کامیاب رہیں۔

واضح رہے کہ گذشتہ پانچ دہائیوں کے دوران فلسطینی مظلوموں کو عالم اسلام سے کوئی حمایت و سرپرستی حاصل نہیں ہوئی بلکہ اس کے برعکس جارڈن میں امریکی اشارہ پر ہزاروں آوارہ وطن فلسطینی عوام کو تلوار کے حوالے کردیا گیا، دیگر اسلامی ملکوں سے فلسطینی مجاہدوں کو صدقہ و زکوٰۃ کے علاوہ اور کچھ نہ حاصل ہوسکا۔ اور شرمناک بات تو یہ ہے کہ اسرائیل کی مکر آمیز تجویز صلح کو عملی رنگ و روپ عطا کرنے میں شاہ فہد نے نمایاں خدمت انجام دی ہے اور پوری دنیا پر ثابت کرنے کی کوشش ہے کہ اسرائیل ایک ناقابل شکست طاقت کا حامل ہے اور یہ بات قطعی مناسب نہیں ہے کہ اسرائیل کے خلاف

اس جدوجہد کو جاری رکھا جائے۔ پس اجمالی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ فلسطینی مظلوموں کو اپنی اس طولانی جدوجہد کے دوران عرب حکومتوں سے زبانی حمایت و سرپرستی کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہو سکا۔

معاہدہ کیمپ ڈیوڈ کے بعد فلسطینی مجاہدوں کو اس حقیقت کا بخوبی اندازہ ہو گیا کہ قومیت کے نام پر انہیں کامیابی حاصل ہونے والی نہیں ہے لہٰذا فلسطینی نوجوانوں نے پرچم توحیدی کے سایہ میں انتفاضہ نامی تنظیم کی تشکیل کے بعد صہیونی جلادوں کے خلاف اپنی مسلحانہ جدوجہد چھیڑ دی اور یہ طے کیا کہ جملہ آور دشمنوں کے خلاف نبرد آزمائی کرتے ہوئے موت کو گلے لگانا زیادہ بہتر ہے۔ اپنی اس شجاعانہ روش کے ذریعہ ان نوجوانوں نے اسرائیل کے اس غرور کو چکنا چور کر دیا کہ اس کا مقابلہ ناممکن ہے۔

آج اسرائیل ان فلسطینی بے گناہوں پر گولہ باری کر رہا ہے جنہیں کیمپ ڈیوڈ معاہدہ صلح کے بموجب آزاد فلسطین میں باقاعدہ آباد کیا گیا تھا۔ اگر یہ قتل عام دنیا کے کسی دور افتادہ علاقے میں بھی رونما ہوا ہوتا تو انسانی حقوق کے نام نہاد ٹھیکداروں نے فلک شگاف نعرے بلند کر دئے ہوتے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا امریکی حمایت کے سایہ میں کام کرنے والے ان عالمی اداروں کی نظر میں فلسطینی مظلوم انسان کہلائے جانے کے لائق بھی نہیں ہیں۔ جی نہیں! ایسا ہرگز نہیں ہے یہ فلسطینی مجاہدین فقط انسان ہی نہیں بلکہ جائز حقوق کی بحالی کی راہ میں اپنا سب کچھ قربان کرنے والے عظیم انسان ہیں جن کا اٹل ارادہ یہ ہے کہ سرزمین فلسطین کو اسرائیلی جلادوں کے چنگل سے آزاد کرانا ہے اور انشاءاللہ دنیا کی انصاف پسند تنظیموں کی حمایت و سرپرستی میں یہ لوگ اپنے مشن میں یقیناً کامیاب ہوں گے۔

☆☆☆

میرزا علی اکبر دھخدا

اور جدید فارسی ادب

از: فخر عالم

فارسی ادبیات میں میرزا علی اکبر دھخدا کی شخصیت سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ ملا غلام حسین اور حاج شیخ نجم آبادی جیسے فضلاء کی صحبتوں، یورپ کے سفر، فرانسیسی زبان وادب کی تحصیل اور بے مثال ذاتی محنت سے علوم قدیم و جدید کے تمام گوشے ان کی نظر میں آچکے تھے۔ ان کی علمی فضیلتوں کا اعتراف علماء اور فضلاء نے کیا ہے اور ''علامہ اجل'' کے لقب کے ساتھ ان کے تحقیقی تبحر کو ہدیہ عقیدت اور خراج حیرت، پیش کیا ہے۔ وہ محقق بھی تھے اور مترجم بھی، عالم بھی تھے اور صحافی بھی، تاریخ داں بھی تھے اور لغت نویس بھی، مزاح نگار بھی تھے اور آزادی خواہ بھی۔ گویا ان کی شخصیت ان کے اپنے ہی لغت نامہ کی طرح دائرۃ المعارف کا درجہ رکھتی ہے۔ اپنے بے نظیر علمی، تحقیقی اور ادبی کارناموں کے اعتبار سے ان کی جامع الصفات شخصیت انسانی ہمت کے دائرے کی وسعت کا احساس دلاتی ہے۔

دھخدا کی صحافتی زندگی کا آغاز اس زمانے میں ہوا جب وہ یورپ سے واپس آئے۔ ایران میں اس وقت تحریک مشروطیت زوروں پر تھی۔ علامہ دھخدا بھی اس کے سرگرم اور پرجوش حامیوں میں سے تھے۔ وطن دوستی اور آزادی خواہی کے جذبے سے سرشار ہو کر انہوں نے مرزا جہانگیر کی رفاقت میں روزنامہ ''صور اسرافیل'' جاری کیا۔ اس پرچے

نے اپنے مخصوص انداز میں آزادی کا وہ صور پھونکا کہ ایوان شاہی تھر تھرانے لگا۔ اس کا فکاہی کالم علامہ دھخدا خود لکھا کرتے تھے۔ دھخدا کی اہمیت یہ ہے کہ انہوں نے فارسی نثر کی تاریخ میں ایک ایسی چیز کی ابتدا کی جو تخلیقی ادب کی ایک خاص صنف ہے۔ دھخدا نے ہیئت اور موضوع دونوں میدانوں میں جدت آفرینی کا ثبوت دیا۔ ان کے مضامین میں اجتماعی تنقید اور اجتماعی ہجو نگاری تھی۔ اس اخبار کی مقبولیت کے پیش نظر بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ جدید ایرانی زندگی کے شعور کی پرورش میں دھخدا کی نگارش بھی شامل رہی ہے۔ دھخدا نے اخباروں کی عربی آمیز بھاری بھرکم زبان کو چھوڑ کر روزمرہ کی زبان کو استعمال کیا اور اپنی شوخی شگفتگی اور طنز کی چاشنی سے نثر کو عوام کے لئے دلپسند بنادیا۔ محمد علی شاہ قاچار نے جب مجلس شوریٰ ملی پر بمباری کرائی اور آزادی خواہوں کو قید و بند اور جلاء وطنی کی صعوبتیں پیش آئیں تو اس وقت دھخدا کو بھی مجبوراً وطن ترک کرنا پڑا۔ انہوں نے سوئٹزرلینڈ سے پھر صور اسرافیل جاری کیا جس کے صرف تین ہی شمارے نکل سکے۔ اس کے بعد دھخدا نے اپنے فکاہی انداز کو جاری نہیں رکھا اور یہ بھی اچھا تھا۔ مشروطیت کی تحریک کے وقت بہت جوش و خروش تھا۔ قیام مشروطیت کے بعد یہ مقصد حاصل ہوچکا تھا اور نیا شعور بھی جنم لے چکا تھا۔ اب حالات بھی ویسا فکاہی مواد پیش کرنے سے قاصر تھے اب اگر وہ اس سلسلے کو جاری رکھتے تو شاید وہ اتنا جاندار نہ ہوتا اس لئے انہوں نے اسے کلائمیکس پر چھوڑدیا۔ یہ ان کی انتہائی دانشمندی تھی۔ ان کی صحافی زندگی کی یاد گاریں روزنامہ سور اصرافیل، سروش، ایران کنونی اور آفتاب میں شائع شدہ سیاسی اور اجتماعی مقالات ہیں۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد دھخدا تہران آئے اور اس کے بعد انہوں نے اپنی سیاسی سرگرمیاں بالکل ترک کردیں۔ فکاہی مضامین کی جگہ ٹھوس علمی مقالات نے لے لی۔

بیان و معانی اور مسائل صرف و نحو پر انہوں نے عالمانہ تبصرہ شروع کیا۔ یہ مقالے "مجلّہ مہر" مجلّہ "ارمغان"،" دانش" "دانشکدہ ادبیات" "آموزش و پرورش" فرہنگ " تعلیم و تربیت" اور مجلّہ فرہنگستان میں شائع ہوتے رہے۔

علامہ کو فارسی کلاسیکیات پر بڑا عبور حاصل تھا۔ ہزاروں قلمی اور مطبوعہ نسخے ان کی نظر سے گزر چکے تھے وہ سامانی اور غزنوی دور کی فارسی کے بڑے عالم تھے۔ متروک اور مروج الفاظ کی نشان دہی میں انہیں بے پناہ قدرت حاصل تھی۔ املا کے اشتباہی گورکھ دھندوں کو حل کرنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ لغت نویسی کے میدان میں ان کا لغت نامہ ایک رفیع الشان اور لاجواب کارنامہ ہے، جس کی مکمل تدوین میں انہوں نے اپنی عمر کے آخری چالیس سال صرف کیئے۔ ایک دائرۃ المعارف قسم کا مبسوط اور جامع لغت نامہ ہے الفاظ کی تحقیق اور تدقیق عمر بھر ان کا شیوہ رہا۔ وہ ایک ایک لفظ کے بارے میں وثوق سے یہ بتلا سکتے تھے کہ یہ لفظ فلاں صدی میں کس نے استعمال کیا، کن معنوں میں استعمال کیا اور کون سے قلمی نسخے میں ملے گا۔

دراصل اس لغت نامہ میں محض الفاظ کے معانی اور ان کے شواہد ہی نہیں بیان کئے گئے بلکہ یہ تاریخ و تمدن کے ہر پہلو سے متعلق معلومات کا ایک نادر خزانہ ہے۔ تاریخی اسماء رجال کے سوانحی خط و خالی اپنے تمام بنیادی اعداد و شمار کے ساتھ منضبط ہیں۔

لغت نامہ کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ لغت "نامہ صرفی" اور نحوی مسائل اور قواعد اور جملہ بندی کے قرینے مختلف اساتذہ نے مختلف علاقوں میں وضع کئے۔ دھخدا کے اس کارنامے کو بڑے بڑے یورپی محققین نے خراج تحسین پیش کیا۔ ہے۔ پیرس کے مدرسہ علوم عالیہ کے پروفیسر لوئی ماسینیوں نے لغت نامہ کی عظمت کا احساس دلانے کے

لئے اسے یونان کے اساطیری رستم ہر کولیس (Hercoles) سے تشبیہ دی ہے۔ مشہور مستشرق پروفیسر ہانری ماسہ نے اسے ایک اثر فنا ناپذیر مانا ہے مطبوعات اسلامی کے (Abstract Islamic) کی رائے یہ ہے کہ تحقیقی اور تنقیدی امثال و شواہد اور تاریخی اور جغرافیائی معلومات کے اعتبار سے یہ لغت جواب نہیں رکھتی۔

اس کے علاوہ حکیم ابوریحان البیرونی کے بارے میں دھخدا نے ایک جامع رسالہ لکھا ہے۔اس میں صرف اس کی زندگی کے حالات پر ہی اکتفا نہیں کی بلکہ مختلف علوم میں اس کے بلند مقام پر تبصرہ بھی کیا ہے۔اسکے علاوہ البیرونی اور ابن سینا کے باہمی سوالات وجوابات بھی بعض قدیم عربی نسخوں سے ترجمہ کردے گئے ہیں جو تاحال عام لوگوں کی دسترس سے باہر تھے اور ساتھ ہی البیرونی کی شہرہ آفاق "کتاب ماللہند پر بھی بحث کی گئی ہے اور یورپ میں اس کتاب کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ان تالیفات کے ساتھ ساتھ دھخدا نے نظم ونثر کے متون کی تصحیح اور تنقیح بھی شروع کی اور عربی فارسی ادب کی بے پایاں خدمت انجام دی۔ دھخدا نے اساتذہ کے بہت سے دواوین کی تصحیح کی اور حواشی لکھے۔ حکیم ناصر خسرو کے دیوان میں اشعار کی تصحیح کے ساتھ ساتھ بہت سے مفید نکات کے ساتھ ایک دلکش مقدمہ لکھا دھخدا کو فرانسیسی زبان پر بڑی قدرت حاصل تھی۔ وہ فرانسیسی زبان اور ادب کے معتبر عالم تھے۔ جوانی کے زمانے میں انہوں نے مانشکیو کی دو مشہور کتابوں کے ترجمے فارسی میں کیے۔ ایک کا نام عظمت وانحطاط رومیان ہے اور دوسری کا نام روح القوانین ہے۔اس کے علاوہ فرانسیسی سے فارسی ایک فرہنگ مرتب کی جس میں فارسی اور عربی کی بلند پایہ بنیادی کتابوں سے اصطلاحات تلاش کر کے فرانسیسی علمی اصطلاحات کے مقابل لکھیں۔شاعر کے لوازمات میں سب سے اہم چیز فرصت ہے۔

شعر کی قوس قزح میں شوخ تخیلی رنگ بھرنے کے لئے ضروری ہے کہ: بیٹھے رہیں تصور جاناں کیے ہوئے'' علامہ دھخدا نہایت ہی عدیم الفرصت انسان تھے۔ انہوں نے سیاسی بکھیڑوں سے کنارہ کشی اختیار کرنے کے بعد اپنی زندگی تحقیق علمی کے لئے وقف کردی۔ فن شاعری میں جو ملکہ انہیں حاصل تھا، اس میں کسے کلام ہو سکتا ہے بلاشبہ وہ ایک زود گو شاعر تھے دھخدا کی شخصیت ایک ہمہ جہت شخصیت ہے۔ فارسی زبان وادب کی ساری تاریخ پر نظر دوڑائی جائے تو یہی کہنا پڑے گا کہ وہ اپنی مثال آپ تھے۔

☆☆☆☆

فصلنامہ راہ اسلام کی اشاعت کا سلسلہ جاری ہے لہٰذا شعراء و محققین حضرات سے استدعا ہے کہ وہ درج ذیل پتہ پر اپنا کلام یا تحقیقی مقالہ ارسال فرمائیں نیز فصلنامہ کو مزید مفید و کارآمد بنانے کے لئے قارئین کرام اپنے مشوروں سے بھی نوازیں تاکہ اس رسالہ کی افادیت میں اضافہ ہو سکے۔

ایڈیٹر فصلنامہ راہ اسلام۔ ۱۸۔ا۔ تلک مارگ، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۱

عالم بشریت کی عظیم الشان خاتون

حضرت فاطمہ زہرا (سلام اللہ علیہا)

از: ڈاکٹر اختر مہدی

خداوند عالم اپنی مقدس کتاب قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے کہ ہم نے ایک مرد اور ایک عورت سے انسانی دنیا کی تخلیق کی ہے! اس الٰہی ارشاد کی روشنی میں صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ خالق کائنات نے مرد کو عورت کا مخالف اور عورت کو مرد کا مخالف بنا کر نہیں بھیجا ہے بلکہ ان دونوں کی قربت و محبت کو انسانی برادری کی بقا کا ضامن قرار دیا ہے اور مذہب اسلام شروع ہی سے اس فلسفہ وجود کی علمبرداری کرتا چلا آرہا ہے اور خداوند عالم کے اس پسندیدہ ترین دین نے عورت کی عظمت کی وکالت کا مقدس فریضہ اس وقت بھی انجام دیا ہے جب دیگر مذاہب کے لوگ خداوند عالم کی اس حیرت انگیز مخلوق کو محض وسیلۂ گناہ تصور کرتے تھے اور اس سے دوری وعلحدگی اختیار کرنے کی دعوت دیا کرتے تھے، اس کو ذلت و رسوائی کا وسیلہ قرار دیتے تھے اور آخر کار اس کو زندہ درگور کردیا کرتے تھے۔ چنانچہ عربی زبان میں مذہب اسلام سے قبل کا جو ادبی شاہکار موجود ہے اس میں عورت کو زندہ دفن کردینے کی بات بڑے فخر کے ساتھ کہی گئی ہے۔ اسلام نے نہ صرف یہ کہ عورت کو ذلت و رسوائی اور نیستی و نابودی کے گڑھے سے باہر نکالا بلکہ صحیح مقام و مرتبہ کی طرف اس کی رہنمائی بھی کی۔ سماج میں رائج اخلاقی مفاسد سے خواتین کو پوری طرح باخبر

کیا انہیں احساس کمتری کے بھنور سے باہر نکالتے ہوئے اس حقیقت کی طرف متوجہ کیا کہ مردوں کی طرح عورتیں بھی خدا کی عظیم مخلوق ہیں بلکہ مرد اپنے وجود کیلئے عورتوں کا محتاج ہوا کرتا ہے اور بعد کی منزلوں میں عورت کی عظمت وشرافت کی حفاظت مرد کا بنیادی فریضہ ہو جاتا ہے۔ الٰہی قوانین کے سایہ میں ان دونوں کی قربت ومحبت انسانی نسل کی بقاو وافزائش کا ذریعہ ہے اور اگر ان میں سے کسی ایک میں بھی ذرہ برابر اخلاقی لغزش پیدا ہوئی تو انسانیت تباہی کے غار میں لڑھک جائے گی، اخلاقی مفاسد کو انسانی محاسن کا نام دے دیا جائے گا اور تہذیبی عریانیت و برہنگی ہی اصل انسانی تہذیب کا رنگ وروپ اختیار کر لیگی۔

موجودہ زمانے میں صورت حال کچھ ایسی ہی ہے۔ موجودہ عالمی انسانی معاشرہ میں عریانیت و برہنگی پر مبنی مغربی تہذیب وتمدن کا غلبہ ہے۔ تعلیم آزادی اور انسانی حقوق کے نام پر عورت کو نئے نئے فریب کا شکار بنایا جارہا ہے۔ مسلسل ثقافتی حملات کے نتیجے میں آج مسلمان خواتین تین حصوں میں تقسیم ہو چکی ہیں۔ ایک جماعت توان خواتین کی ہے جو اپنے قدیم اور روایتی انداز وطرز حیات پر ثابت قدم ہیں۔ دوسری جماعت ان مسلم خواتین کی ہے جنہوں نے پوری طرح مغربی تہذیب وتمدن اختیار کرلیا ہے اور تیسری قسم ان خواتین کی ہے جو قدیم اور موروثی روایات کی متحمل نہیں ہیں لیکن مغربی تہذیب کے ماحول میں انہیں گھٹن محسوس ہوتی ہے اور ان کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ آخر کیا کریں؟ انہیں ایک ایسے نمونے کی تلاش ہے جس کی زندگی کو وہ لائحہ عمل بنا سکیں۔ خداوند عالم نے پیغمبر اکرمؐ کی ذات کو قیامت تک کے لئے اسوۂ حسنہ ۲ قرار دیا ہے۔ پس خواتین کے لئے جگر گوشہ رسول حضرت فاطمہ (س) کی زندگی سے بہتر نمونہ کہاں دستیاب ہو سکتا ہے

جن کی زندگی کا ہر شعبہ ایک مکمل درس کی حیثیت رکھتا ہے۔

جی ہاں! حضرت فاطمہ (س) نے بیٹی، بیوی اور ماں کی حیثیت سے صرف مسلمان خاتون ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کی خواتین کو جو درس دیا ہے اس کی پیروی کے ذریعہ انسانیت یقیناً معراج حاصل کر سکتی ہے اور آج دنیائے بشریت جن مسائل سے دوچار ہے ان مسائل کو ہمیشہ کے لئے نابود کیا جا سکتا ہے۔

پس ہم اس مختصر مگر مقدس گھر کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں جو ایسی عظیم مسجد کے قریب واقع ہے جس کو اسلام کی پہلی مضبوط چھاونی اور مرکز وحی و رسالت و حمایت و تربیت کا درجہ حاصل رہا ہے۔ جی ہاں! فقط اسی گھر کو یہ امتیازی حیثیت حاصل تھی کہ اس کا دروازہ مسجد نبوی کے اندر کی طرف کھلے! کیونکہ یہ حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کا گھر ہے۔ یہی وہ گھر ہے جو پیغمبر اکرمؐ اور ان کے وصی حضرت علی بن ابی طالبؑ کی پناہ گاہ ہے۔ پیغمبرؐ جب گھر سے کسی جنگ یا سفر کے لئے نکلتے ہیں یا کسی جنگ یا سفر سے واپس آتے ہیں تو وہ اپنی پارہ جگر فاطمہ سے ملاقات یا خدا حافظی کے لئے اس گھر میں ضرور آتے ہیں۔ فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ کیا یہ خاتون اس مسجد کی محافظ و مالک ہیں؟ کیا یہ گھر جنگ اور جھگڑے کے زمانے میں ایک پناہ گاہ کی حیثیت رکھتا ہے؟ کیا یہ کسی ایسے دولتمند کا گھر ہے جو مسجد کے جملہ اخراجات پورا کرتا ہے؟ کیا یہ امام جماعت کا گھر ہے؟ جی ہاں! ایک دنیادار دولت مند کے علاوہ اس گھر کے مالک میں جملہ صفات بدرجہ اتم موجود ہیں کیونکہ تمام اہل مسجد اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ اس گھر کے مالک نے کبھی بھی دنیوی مال و دولت اور شان و شوکت حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی ہے اور یہ دولت ان لوگوں کے کام کی نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس قرآن کریم نے ان لوگوں کے تین روزہ

کی داستان ضرور نقل کی ہے کہ یہ لوگ افطار اور سحر کئے بغیر تین روز تک لگاتار روزہ رکھتے ہیں اور افطار کا سامان ضرورت مند فقیر و مسکین کے سپرد کر دیتے ہیں۔ واضح رہے کہ اس ایثار و کار خیر کا مقصد بھی دنیوی شہرت و مقبولیت حاصل کرنا نہیں بلکہ خداوند عالم کی خوشنودی حاصل کرنا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے۔ "انما نطعمکم لوجه الله لانرید منکم جزاء ولاشکورا" (سورہ انسان) غور طلب بات ہے کہ اس گھر کے لوگ بھوک و پیاس کی شدت کے باوجود تین روز تک مسلسل روزہ رکھتے ہیں اور اس کے بدلے کسی اجر و پاداش یا شکریہ کی بھی تمنا نہیں کرتے کیونکہ ان کا یہ عمل خدا کے لئے کئے جانے والے کام کا نمونہ ہے۔

پس اس گھرانے کی یاد تازہ رکھنا ایک بہترین نمونہ ہے اور سورۂ نور کی آیات کے بعد دیگری اسی گھر کی توصیف میں نازل ہوئی ہیں اور اس گھر کو خصوصی اہمیت حاصل رہی ہے اور خداوند عالم نے اسے خصوصی عظمت و سربلندی عطا کی ہے اور یہ عظمت و سربلندی مادی نوعیت کی حامل نہیں ہے بلکہ اس گھر والوں کو قرآن جیسی عظمت و بزرگی حاصل ہے کیونکہ قرآن اور اس گھر کی محور یعنی فاطمہ دونوں ہی خداوند عالم کا مخصوص عطیہ ہیں چنانچہ قرآن مجید کے سلسلے میں ارشاد خداوندی ہوتا ہے۔ "ولقد آتیناك سبعا من المثانی والقرآن الحکیم۔" (سورہ حجر آیت ۸۷) اور حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کے سلسلے میں ارشاد ہوتا ہے "انا عطیناك الکوثر۔" (سورہ کوثر آیت ۱) دلچسپ بات یہ ہے کہ خداوند عالم کی طرف سے پیغمبر کو جو دیگر تحفے عطا کئے گئے ہیں ان کا قرآن مجید میں اس اہمیت کے ساتھ ذکر نہیں کیا گیا ہے اور اگر غور سے دیکھا جائے تو مذکورہ دونوں کلمات کے درمیان لفظ اعطاء کی اہمیت روز روشن کی طرح واضح اور نمایاں ہے۔

قطره هاى بحر را نتوان شمرد
هفت دريا پيش آن بحر ست خرد

پیغمبر اکرمؐ اس گرانقدر عطیہ خداوندی یعنی حضرت فاطمہ (س) کو "ام ابیہا" کے لقب سے یاد کیا کرتے تھے جس کا مطلب ہے اپنے باپ کی ماں جس کا مقصد محض حضرت آمنہ کی مادرانہ شفقت و محبت کی یاد تازہ کرنا ہی نہیں ہے کیونکہ ان کے انتقال کے وقت پیغمبر کی عمر صرف دو سال تھی۔ اس لقب کا مقصد اس محبت پدری کا اظہار واعلان بھی نہیں ہے جو عموماً ہر باپ کو اپنی بیٹی سے ہوا کرتا ہے۔ نہیں، نہیں! یہ محض خدیجہ کی اکلوتی یادگار سے پیار و محبت کا اظہار ہرگز نہیں ہے کیونکہ پیغمبر تو پوری کائنات سے برتر وافضل ہیں اور ان کا انداز فکر عام مادی انسانوں جیسا نہیں ہے بلکہ ان کی زبان سے حافظ کہتے ہیں۔

من که ملول گشتمی از نفس فرشتگان
قيل ومقال عالمی می کشم از برای تو

واضح رہے کہ پیغمبر کی دنیا اور پیغمبر کا عشق تو ذات خداوندی ہے اور پیغمبر وہی چاہتا ہے جو خدا چاہتا ہے اور خداوند عالم نے پیغمبر کو چاہا ہے۔ دونوں کے درمیان عاشق و معشوق کا رابطہ ہے اور اسی حقیقت کو نگاہ میں رکھتے ہوئے خداوند عالم نے حدیث قدسی میں ارشاد فرمایا ہے۔ " لولاك لما خلقت الافلاك" اور نامور فارسی شاعر مولوی روم نے خداوند عالم اور پیغمبر اکرم کے درمیان عاشقانہ روابط پر مشتمل حدیث قدسی کی تفسیر اس انداز میں پیش کی ہے۔

عشق چو شد بحر را مانند ريگ
عشق ساید کوه را مانند ريگ

عشق بشکافد فلک را صد شکاف
عشق لزاند زمین را از گزاف
با محمدؐ بود عشق پاک جفت
بہر عشق او را خدا لولاک گفت
منتہی در عشق چون او بود فرد
پس مر او را زانبیاء تخصیص کرد
گرنبودی بہر عشق پاک را
کی وجودی دادمی افلاک را

پس حضرت فاطمہ زہرا (س) کی ذات میں ایسا کون سا راز پوشیدہ تھا جس کی وجہ سے پیغمبر اکرمؐ نے انہیں "اپنے باپ کی ماں" کے لقب سے یاد فرمایا ہے؟

غور طلب بات ہے کہ دور جاہلیت میں لڑکیوں کو زندہ در گور کر دیا جاتا تھا اور بیٹی باپ کیلئے ذلت و رسوائی کا ذریعہ سمجھی جاتی تھی۔ ایسے سماجی ماحول میں پیغمبر نے اپنی بیٹی کا غیر معمولی احترام کر کے اس دور کے جاہلانہ و ظالمانہ سماجی نظام کی اعلانیہ مخالفت کی تھی۔

اگرچہ یہ تفسیر پیغمبر کے پیغام کو زیادہ بہتر ڈھنگ سے سمجھنے میں مدد ضرور کرتی ہے اور اس کی مدد سے پیغمبر کی ذاتی اور جذباتی خصوصیتوں کی جھلک بھی سامنے آجاتی ہے اور یہ واضح ہو جاتا ہے کہ پیغمبر دور جاہلیت کی خرافات باتوں کے خلاف نبرد آزمائی کا اٹل ارادہ رکھتے تھے لیکن ان تمام خوبیوں کے باوجود یہ تفسیر سطحی معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس کے مطابق حضرت فاطمہ کی حیثیت دور جاہلیت کی عام عورتوں کے برابر ہو جاتی ہے اور بیٹی سے پیغمبر کی غیر معمولی محبت دور جاہلیت کی سماجی خرابیوں اور بدعنوانیوں کے خلاف

ان کی مثالی جدو جہد کاوسیلہ بن جاتی ہے۔ پس اگر اس عبادت کا مقصد نہ سماجی تعلق ہے اور نہ ذاتی رابطہ تو غور طلب امر ہے کہ آخر اس کا مقصد کیا ہے؟

جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جاچکا ہے کہ خداوند عالم نے ہمارے پیغمبر کی محبت کے صدقے میں ہی اس کائنات کو زیور وجود سے آراستہ کیا ہے اور محمدؐ کی ہستی ایک خدائی ہستی تھی اور ان کا وجود مبارک عشق خداوندی کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا اگر وہ کسی کو دوست رکھتے تھے تو محض خدا کے لئے اور اگر کسی سے دشمنی رکھتے تھے تو اس کی کسوٹی بھی ذات خداوندی تھی۔ پس اگر وہ حضرت فاطمہؑ سے محبت کرتے تھے اور انہیں اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے تو وہ بھی خدا کے لئے کیونکہ فاطمہؑ پیغمبر کو عطا کئے جانے والے دو عظیم تحفوں میں سے ایک تھیں اور ان کی عظمت و منزلت کی وجہ یہ تھی کہ وہ رسالت نبوی کا پشتوانہ اور بنیاد تھیں اور اسی وجہ سے پیغمبر اکرمؐ ان کی تعظیم کیا کرتے تھے اور اس کے علاوہ اس غیر معمولی عظمت کی کوئی دوسری وجہ نہیں تھی۔

اس بات کی مزید و مکمل وضاحت کے لئے تاریخ اسلام کا سرسری جائزہ لینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

اقتصادی ناکہ بندی کے دوران شعب ابی طالب میں ہر ممکن مصائب و آلام کے باوجود فاطمہ صبر و وفا، شرف و وقار اور فراست و دانائی کا مجسمہ اور پیغمبرؐ و علیؑ کی زندگی کا محور و مرکز نظر آتی ہیں۔ فاطمہؑ کا چہرہ دیکھتے ہی دونوں کی تھکاوٹ دور ہو جاتی ہے۔ جنگ کے دوران زخمی ہونے کے بعد یہ دونوں فاطمہؑ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں اور فاطمہ انتہائی جرأت و ہمت کے ساتھ ایک ماہر معالج کی حیثیت سے اپنی جان سے زیادہ عزیز زخمیوں کا باقاعدہ علاج کرتی ہیں اور اپنی زبان پر شکوہ و شکایت نہیں لاتی ہیں۔

انہوں نے اپنے دامن تربیت میں ایسے بچوں کو پروان چڑھایا جو کمسنی کے زمانے میں بھی معلم تقویٰ و پرہیزگاری اور محافظ اصول واحکام شریعت تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ بچوں کی تربیت و پرورش کے ساتھ ہی وہ گھریلو کام کاج میں اپنی کنیز فضہ کا ہاتھ بھی بٹاتی ہیں۔

ان کی اولاد نے مذہب اسلام کی ڈٹ کر حفاظت کی اور اپنی جان نچھاور کر دی مگر زینب (س) انقلاب حسینی کی پیغامبر اور اپنی ماں کی طرح صبر و استقامت کا پیکر اور عورتوں کی عظمت کی محافظ ہیں۔

فاطمہ 'ام الائمہ یعنی اماموں کی ماں ہیں۔ پس ان عظیم صفات کی حامل خاتون حضرت فاطمہ فقط اماموں کی ماں ہی نہیں بلکہ پیغمبر کی ماں بھی ہیں۔ یعنی پیغمبر اسلام اور باپ کی ماں کا مطلب ہے مادر اسلام کیونکہ اسلام اور پیغمبر کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔

دیکھئے! ظاہری اعتبار سے ایک جزباتی یا سماجی جملہ کس طرح سے ایک دوسرا معنی و مفہوم حاصل کرلیتا ہے اور کس طرح اپنے اندر ایک دنیا پوشیدہ رکھتا ہے یہ جملہ دیکھنے میں نہایت مختصر ہے لیکن اس کی جامعیت کا عالم یہ ہے کہ اس میں ماضی و مستقبل کی اطلاعات کا بیش قیمت خزانہ چھپا ہوا ہے اور ہر سال ان کی سالگرہ ولادت کے موقع ہر ہم ان کی یادوں کو تازہ کر لیتے ہیں اور ان کے فرزند عزیز امام حجت حضرت مہدی آخر الزماں کی خدمت میں پر خلوص مبارکباد پیش کرنے کا شرف حاصل کر لیتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ صاحب عظمت و کامیاب مرد کے ساتھ اس سے زیادہ عظیم و کامیاب خاتون ہوا کرتی ہے یعنی اگر کسی مرد نے عظمت و بزرگی حاصل کرلی ہو تو یہ فطری طور پر سمجھ لینا چاہئے کہ اس کی عظمت و کامیابی میں اس سے زیادہ عظیم و کامیاب خاتون کا

ہاتھ ہے۔ یہ کسی معصوم کا قول نہیں ہے اور نہ ہی اس کو ثابت کرنے کے لئے دلائل وشواہد پیش کرنے کی چنداں ضرورت محسوس ہوتی ہے لیکن یہ بات حقیقت سے عاری اور دور نہیں ہے پھر بھی اس سلسلے میں بیشمار استثنائی واقعات موجود ہیں اور حضرت نوح کو مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے جو ایک ایسی عورت کے چنگل میں گرفتار ہوئے جو قدر ناشناس تھی اور دوسری طرف فرعون کی مثال ہماری نگاہوں کے سامنے ہے جس کی زوجہ ایک عظیم خاتون تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ مریم کے ساتھ، حضرت موسیٰ اپنی ماں اور حضرت شعیب کی بیٹی اپنی زوجہ جیسی خواتین کے ساتھ حضرت ابراہیمؑ ھاجرہ کے ساتھ، محمدؐ و علیؑ حضرت خدیجہ اور حضرت فاطمہ (س) کے ساتھ اور حضرت ابوالفضل وان کے بھائی حضرت ام البنین کے ساتھ پہچانے جاتے ہیں اور پیغمبر وائمہ معصومین کے بعد جو عظیم وکامیاب شخصیت دکھائی دیتی ہے اس کی کامیابی میں اس کی ماں یا اس کی زوجہ کی کوشش ضرور کارفرما ہوتی ہے جس کی بدولت اس کو یہ مقام ومرتبہ حاصل ہوتا ہے امام خمینیؒ کا ارشاد ہے۔

"مرد کو عورت کے دامن سے معراج حاصل ہوتی ہے۔" اور یہ بات اس روایات کی بنیاد پر مستند ہے جس میں ارشاد ہوتا ہے۔" الجنة تحت اقدام امهاتكم۔" یعنی ماں کے پیر کے نیچے بہشت ہے۔

وہ جو یاایھا المزمل میں مزل کے ساتھ اور یا ایھا المدثر میں مدثر کے ساتھ ہیں اور نزول وحی کے موقع پر ہونے والی لرزش کو پیغمبر کے لئے آسان کردیتی ہیں وہ حضرت خدیجہ ہیں اور ان کے بعد ان کی بیٹی حضرت فاطمہ کی ذات گرامی ہے اور اسی طرح

کوہ طور پر خداوند عالم کے خطاب کے دوران حضرت موسیٰ پر طاری خوف وہراس کو دور کرنے والی ان کی زوجہ ہیں جو حضرت شعیبؑ کی بیٹی تھیں۔اسی طرح یہ صفاو مروہ کے درمیان حضرت ہاجرہ کی سعی و کوشش ہے جو حضرت ابراہیم کی رسالت کی تکمیل کرتی ہے اور اس سعی و کوشش کی اہمیت کا اندازہ اس طرح کیا جاسکتا ہے کہ سعی کے بغیر حج نہیں ہے اور اسی طرح اگر طواف نساء نہ کیا جائے تو حج کے تمام ارکان پورے نہیں ہو سکتے۔

افسوس کی بات ہے کہ اسلامی معارف ناشناختہ رہ گئے ہیں اور مسلمانوں کے درمیان ایسے غلط عقائد کے سلسلے میں جن عام خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے وہ بالکل بے بنیاد ہیں اور ان کا اسلام سے کوئی سروکار نہیں ہے اور حقیقت یہ ہے کہ عورت کی عظمت و بزرگی میں کمی کا مطلب انسان کی عظمت و منزلت میں کمی ہے۔

حافظ کہتے ہیں۔

یارب آن زاہد خود بین کہ بجز عیب ندید
دود آہش در آئینہ ادراک انداز

تاریخ اسلام میں روایات اور حکایات کے درمیان تناقص وابہام کی کثرت دکھائی دیتی ہے۔مرد کی تاریخی محوری و مرکزیت نے مردوں کی تاریخ لکھی ہے۔اس تاریخ نے تعلیم و تربیت کو فقط مردوں کا خاصہ قرار دیا ہے۔سماج اور سماجی نظامت کو فقط مردوں کے لئے مخصوص قرار دیا ہے جبکہ ہر عقل سلیم مختصر سی توجہ کے ذریعہ اس نتیجے پر پہونچ جاتی ہے کہ اس تاریخ میں جس سماج کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ عورتوں سے خالی نہیں رہا نیز مٹھی بھر ایمان لانے والے لوگوں کے درمیان بھی اسلام کی تبلیغ واشاعت کا میدان فقط مردوں کی جولانگاہ نہیں رہا بلکہ اس سلسلے میں خواتین نے بھی نمایاں کردار ادا کیا ہے۔یہ

لوگ اس زمانے کی عورت کو غلام تصور کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اس زمانے کا انسانی معاشرہ ایسی عورتوں سے خالی تھا جو معاشرہ میں نمایاں اور اثر انداز حیثیت کی حامل تھیں۔ جب یہ لوگ تجارت اور مال اندوزی کے لئے کوئی سند پیش کرنا چاہتے ہیں تو حضرت خدیجہ کی مثال پیش کرتے ہیں اور جب یہ لوگ اپنی ظالمانہ راہ و روش کے بموجب عورت کا بدنما چہرہ دکھانا چاہتے ہیں توان میں اتنی جرأت نہیں ہو پاتی کہ حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے چہرہ کو مخدوش کر سکیں۔

کیا یہ تصور بھی کیا جاسکتا ہے کہ خدیجہ و پیغمبر کی بیٹی حضرت فاطمہ، جس کی قرآن نے مدح سرائی کی ہے۔ نعوذ باللہ ایک نادان، کم عقل اور اس معاشرہ میں کوئی اثر ورسوخ نہ رکھنے والی خاتون رہی ہیں ؟!

در حقیقت خواتین کے لئے اسلامی اصول و احکام اور تعلیم و تربیت کا محور و مرکز فاطمہؑ رہی ہیں، اماموں کی تربیت کی بنیاد مصحف فاطمہ یا کتاب فاطمہ رہی ہے اور اس معاشرہ کی نظامت کی ذمہ داری حضرت فاطمہؑ کے کندھوں پر ہی رہی ہے جس میں مرد اکثر جنگ وجدال میں مشغول رہے ہیں۔ فاطمہؑ ایک عام بیٹی یا عام بیوی کی طرح نہیں رہیں بلکہ تاریخ نے ان کی ایک تقریر کو اپنے دامن میں محفوظ کر رکھا ہے اور خدا بہتر جانتا ہے کہ انہوں نے اس قسم کی دوسری تقریریں بھی کی ہیں۔ مردوں نے یہ روایت کی ہے کہ حضرت فاطمہ (س) شکل و صورت اور طرز خطابت میں بالکل رسول اللہؐ سے مشابہ رہی ہیں۔ آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ گھر کی چہار دیواری کے اندر مقید ہمہ وقت امور خانہ داری میں لگی رہنے والی خاتون حضرت فاطمہ اپنی ایسی تصویر پیش کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ فاطمہ پر ظلم و مظالم کا سلسلہ محض اسی دور تک محدود نہیں رہا بلکہ وہ آج بھی جاری ہے۔ اس

دور کی تاریخ کے چہرے کے پیچھے ایسی کونسی طاقت رہی ہے جس نے اسلام کی اساس کو اس قدر مخدوش کر دیا ہے کہ دوستداران حضرت فاطمہ بھی یہ سمجھنے لگے ہیں کہ فاطمہ فقط ایک ستم رسیدہ، مظلوم، بی سواد اور انسانی معاشرہ میں کوئی اثرورسوخ نہ رکھنے والی خاتون رہی ہیں۔

وہ فاطمہ جو اسلام کی ماں، خواتین مدینہ کی تربیت و نظامت کا مرکز اور ایک عالمہ غیر معلّمہ تھیں جن کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ حامل وحی مستقیم ہیں لیکن مسلمان عورت کے روپ میں ان کی عظمت کو اس حد تک گھٹایا گیا کہ آج ان کے بارے میں لکھتے وقت ہر آدمی بیجا تکلف کا مظاہرہ کرتا ہے ان کی شخصیت حقیقت پر مبنی ہے اور اگر یہ حقیقت پر مبنی نہ ہوتی تو قرآن ایک بیٹی کو اس قدر باعظمت قرار نہ دیتا۔

اگر خداوند عالم چاہتا تو پیغمبر اسلام کو ایک نہیں بلکہ دس بیٹے عطا کر دیتا لیکن وہ پیغمبر کی محض ایک بیٹی کو ہی باقی رکھتا ہے اور اسی بیٹی سے پیغمبر کی نسل باقی رہتی ہے۔ کیا یہ بات عورتوں کی عظمت و اہمیت کو ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں ہے۔ کیا سورۂ نور جس کا آغاز ان آیات سے ہوتا ہے جو عورتوں کے بارے میں ہیں پھر آیۂ نور کا ذکر آتا ہے، نور محمدی کے بارے میں نہیں ہے کیا سورۂ نور کو فقط علم و دانائی کی تاویلات کے دائرہ میں ہی محدود کر دینا چاہئے اور سورۂ نور کے ذیل میں جن باتوں کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے انہیں فراموش کر دینا چاہئے؟

اگر چاہتے ہیں کہ ہمارا اشمار اہلبیت بالخصوص فاطمہ پر ظلم ڈھانے والے گروہ میں نہ ہو تو پہلی فرصت میں ہم لوگوں کو چاہئے کہ ہم عورت کو سطحی نگاہ سے دیکھنا چھوڑ دیں اور عورتوں کے سلسلے میں مقبول اسلامی احکام کا بغور مطالعہ کریں تاکہ ہم لوگوں کو عورت اور

اس کی عظمت کی صحیح شناخت ہو سکے اور ہم اس حقیقت سے باخبر ہو سکیں کہ انسانیت اسلام کی روح و بنیاد ہے اور اسلام نے عورتوں اور مردوں کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا ہے اور ایمان و تقویٰ دونوں کے لئے مساوی ہے اور اسی طرح دونوں کی انفرادی اور اجتماعی تاثیر گزاری بھی بالکل واضح ہے۔ دونوں میں سے ایک کا امتیاز دوسرے کے امتیاز کی تکمیل کرتا ہے۔ جہالت اور فریب اس وقت دکھائی دیتا ہے جب عورت کو مرد کی مرکزیت کی طرف کھینچا جائے اور یہ سوال کیا جائے کہ عورت و مرد برابر ہیں یا نہیں؟

آخر وہ مرد کون ہے کہ عورت اس کے برابر حقوق کی خواہش کرے؟ انسانی حقوق کو مستقبل اور آئندہ کی تعمیر و تشکیل کے سلسلے میں مد نظر قرار دینا چاہئے نہ یہ کہ حقوق کو مساوی قرار دینے کی بات کی جائے۔ مرد نے آغازِ آفرینش میں زندگی کا حق عورت سے حاصل کیا لیکن ابتدائی مرحلہ میں ہی اس کی عظمت میں کمی واقع کر دی اور مرد کو انسانیت کا محور و مرکز بنا دیا۔

☆☆☆☆

حوالے:

۱۔ سورہ حجرات آیت ۱۳

۲۔ سورہ سورہ احزاب آیت ۲۱

سماجی اور اقتصادی انصاف
قرآن اور نہج البلاغہ کی روشنی میں

پروفیسر شاہ محمد وسیم، شعبہ کامرس
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

اس استفسار پر کہ موجودہ زمانے میں مصیبتوں اور صعوبتوں کی اصل وجہ کیا ہے، جواب دینے والا بہت کچھ اور کچھ بھی کہہ سکتا ہے۔ لیکن اگر اس سے کہا جائے کہ ان تمام تر وجوہات کو جو زمانہ کی پریشانیوں اور بدحالیوں کے عوامل ہیں، صرف ایک اور ایک لفظ میں بیان کردے تو وہ اعتماد اور یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہے "ناانصافی" کیونکہ یہ عدل کا مفقود ہونا ہی ہے، چاہے وہ "جزوی" طور پر ہو یا "کلی" طور پر، جس کی وجہ سے بے اطمینانی کی فضا پیدا ہوتی ہے اور افکار واقدامات مجروح ہوتے چلے جاتے ہیں اور نتیجتاً وہ تصورات اور اعمال ظہور پذیر ہوتے ہیں جو خود بھی عدل وانصاف سے دور ہوتے چلے جاتے ہیں اور عمل اور رد عمل کا ایسا سلسلہ وجود میں آتا ہے کہ جن کی زد پر قصوروار اور بے قصور دونوں ہی ہوتے ہیں۔ حالات بد سے بدتر اس وقت اور بھی ہو جاتے ہیں جب یہ بدعنوانیاں چاہے۔ بظاہر وہ کتنی ہی کم نظر آئیں، مرکز اور حکام بالا کے ہاتھوں سرزد ہوتی ہیں۔ کیونکہ ایسی صورت میں مرکز سے جتنی دوری بڑھتی جاتی ہے۔ بدعنوانیوں اور ناانصافیوں کا جال پھیلتا چلا جاتا ہے۔

مسائل سے دو چار اس عصر جدید میں انسانی تعلقات میں کشیدگی اور الجھنوں کے

مد نظر، جب بہتری کیساتھ ساتھ حق اور حق کو جاننے کے لئے انسانی حقوق کی بات کی جاتی ہے تو اکثر لوگ پریشان اور لاجواب سے نظر آتے ہیں لیکن اگر ہم تعصب سے قطع نظر ان شخصیتوں کی عظمت ان کے اقدامات اور ان کی زندگی پر نظر کریں جنہوں نے حق کو قائم اور دائم رکھا اور عدل وانصاف کے ساتھ فیصلے سنائے وہ لوگ جو اپنے بعد آنے والوں کے لئے سرمایۂ عقل وفہم چھوڑ گئے، تو اقتصادی اور سماجی استحکام وجود میں آسکتا ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ ایک متلاشی حق، ان کے اقدامات اور اقوال پر غور کرے۔ وہ جو نمونۂ عمل ہیں اور الوہی اقدار کے سچے علمبردار!

یہ بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ یہ انصاف پرور حکومت اور اس کے اقدامات عدل وانصاف ہی ہیں جو عوام کے اعتماد اور بھروسہ کو حاصل کرسکتے ہیں۔ قرآنی احکامات 'احادیث نبوی اور آئمہ معصومینؑ کی زندگی اور ان کے اقوال اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ حکمرانوں کو ایک مثالی زندگی کا حامل ہونا چاہئے تاکہ محروم افراد (Have-nots) اور وہ کہ جو انصاف کے طلبگار ہیں، ان کی زندگی اور اقدامات کو نمونۂ عمل جان کر خود اپنی زندگیوں کو بہتر بنانے کے لئے کوشاں نظر آئیں۔ اس طرح سارا معاشرہ ترقی کرتا ہوا ایک باضابطہ نظام حیات کو پاسکتا ہے۔ یہاں یہ بھی بیان کردینا مناسب ہوگا کہ کوئی بھی طرز زندگی اور نظام حیات مستحکم اور ترقی پزیر ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ وہ عدل وانصاف کی ٹھوس بنیادوں پر قائم نہ کیا جاوے۔

قرآن اور نہج البلاغہ کی رو سے اقتصادی اور سماجی انصاف پر کچھ لکھنے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام اور سوشلزم پر مبنی معیشتوں کا ذکر کردیا جائے کہ "... دونوں طرح کے سماجوں (سرمایہ دارانہ اور سوشلسٹ نظام) کی اساسی

خاصیتیں اسلامی معاشرہ پر لاگو نہیں ہوتیں کیونکہ اسلامی معاشرہ سرمایہ دارانہ نظام کے اس نظریہ سے متفق نہیں ہے کہ (صرف) نجی ملکیت ہی اصل اصول ہے، نہ سوشلزم کے اس نظریہ سے کہ مشترکہ ملکیت ہی عام اصول ہے۔ اس کے برعکس وہ (اسلامی نظام) ایک ہی وقت میں ملکیت کے مختلف النوع طریقوں کو منظوری دیتا ہے اور اس طرح وہ ملکیت کے متعدد طریقوں کو وضع کرتا ہے"[1] "اسلامی معیشت کا دوسرا جزو افراد کو اقتصادی سطح پر محدود آزادی عطا کرتا ہے، جو روحانیت اور کردار کے ان اصولوں کے دائرے میں ہوں جن پر اسلام کا اعتقاد ہے۔"

"ان جزویات میں بھی ہم اسلامی معیشت کے مقابلے میں سرمایہ دارانہ نظام اور سوشلزم میں نمایاں فرق پاتے ہیں۔" جبکہ سرمایہ دارانہ معیشت کے تحت افراد لامحدود آزادی پاتے ہیں اور اس کے برعکس سوشلسٹ معیشت سب کی آزادی سلب کرلیتی ہے۔ اسلام ایک ایسا رویہ اپناتا ہے جو اس کی عام روش سے مطابقت رکھتا ہے۔ اس طرح یہ اسلام افراد کو آزادانہ اقدامات کی اجازت ان اقدار اور اصولوں کی حدود کے تحت عطا کرتا ہے، جو ان کی تربیت کے ساتھ ساتھ [ایک ایسی] آزادی عطا کرتا ہے جو [وقت کے ساتھ ساتھ] اور بھی بڑھتی اور چمکتی رہے تاکہ یہ [آزادی] تمام انسانیت [کی فلاح و بہبود] کے لئے ایک بہترین وسیلہ بن جائے۔"[2]

اسلامی معیشت کا تیسرا اصول 'باہمی ذمہ داری اور سماجی انصاف' کا ہے۔ "سماجی انصاف کی پہچان دو عام اصولوں کو سموئے ہوئے ہے [ان میں سے] ہر ایک کا اپنا اپنا طریقہ اور منفرد انداز ہے۔ ان کا پہلا [اصول] ہے عام باہمی ذمہ داری کا اصول اور دوسرا ہے سماجی توازن کا اصول ۔ اصلاً منصفانہ سماجی اقدار اسلام کے نظریۂ باہمی ذمہ داری اور توازن

کے اصول کے تحت حاصل ہوتے ہیں۔ انہیں میں سماجی انصاف کا اسلامی معیار حاصل ہوتا ہے... ایک بہترین انسانی معاشرہ کی نشو نما میں اسلام نے اپنے تابناک تاریخی تجربہ کے وقت جو اقدامات کئے وہ اس کے اپنے نظام معیشت کے اصولوں کے عین مطابق، واضح اور عیاں تھے۔"[۳]

اسلام کی وابستگی انسان [کی زندگی] کے نفسیاتی جزو سے بالکل ظاہر اور عیاں ہے کیونکہ اسلام "ان [انسانوں] کی روحانی اور دانشورانہ نشو و نما کو نتائج اور نظریات سے ہم آہنگ بنانا چاہتا ہے۔"

اس طرح اسلام ایک منصفانہ سماجی اور اقتصادی نظام کی تشکیل کرتا ہے۔ [ایسا نظام] جس میں "... زور وزبردستی کی صورت حال کا وجود نہیں ہوتا [جہاں] امیر غریبوں سے سخت گیر لہجہ میں گفتگو نہیں کرسکتے۔ [اور] انہیں کم اجرت پر کام کرنے کے لئے مجبور نہیں کرسکتے۔ مستضعفین کو مستحکم کرنا چاہئے اور ان [کی حالت] کو بدلنا چاہئے۔"[۴]

انسان کو اللہ نے خلق کیا ہے لہٰذا اسے باہمی زندگی MUTUAL EXISTENCE کے اصولوں کو مد نظر رکھتے ہوئے، اسی کے بندے کی طرح زندگی گذارنا چاہئے۔ صرف بقائے باہم [CO-EXISTENCE] ہی کافی نہیں ہے۔ اس طرح ہمیں حق و انصاف امن اور اماں کے معیاری اصولوں کو مد نظر رکھتے ہوئے ایک بامقصد زندگی گزارنے کی ترغیب ملے گی۔ ہمیں صرف اپنے تئیں ہی ایماندار نہیں رہنا بلکہ دوسروں کے ساتھ بھی منصفانہ طور سے پیش آنا چاہئے، ہر ایک کے ساتھ انصاف کرنا چاہئے۔ اپنے دوستوں اور دشمنوں کے ساتھ یکساں طور سے۔ حدیث پیغمبرؐ کی رو سے لوگ مثل کنگھی کے دانے کے ہیں [الناس کالانسان المثط] لہٰذا ہم سب کو ایک

دوسرے سے مل جل کر امن وامان کے ساتھ زندگی گذارنا چاہئے۔ اللہ نے انسان کو روئے زمین پر اپنا خلیفہ مقرر کیا ہے[انی جاعمل فی الارض خلیفة]اس لئے اس دنیا کے تمام وسائل بھی اس کے تصرف کے لئے خلق کئے گئے ہیں۔ اسی لئے اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ تمام چیزوں کو جو اس کے زیر نگیں ہوں یا اس کے قبضے میں ہوں، ایک متولی[Trustee]اور نگراں کی نظر سے دیکھے اوران کی حفاظت کرے کیونکہ ان تمام چیزوں کا خالق تو اللہ ہے۔ وہی حاکم اعلیٰ ہے۔ اس اصول کے تحت ہمارے آپسی تعلقات بامقصد زندگی کے اصول زرین پر مبنی ہونا چاہئے نہ کہ ناانصافی اور استحصال کے مقاصد کے تحت۔ ہمیں عدل وانصاف کو بروئے کار لانا چاہئے تاکہ امن وامان کا بول بالا ہو اور سب کو عزت وعافیت کی زندگی جینے کا حق ملے۔ ہمیں ہمیشہ یہ خیال رکھنا چاہئے کہ یہ دنیا تو ایک غیر مستقل منزل حیات ہے۔ آخری آرامگاہ تو بس وہ جگہ ہوگی جو مابعد حیات دنیا ہوگی۔ جہاں ہر ہر فرد کو اپنی زندگی اور اساسہ کا حساب دینا ہوگا۔ انہیں کیسے حاصل کیا گیا اور کس طرح مصرف میں لایا گیا؟

حدیث میں وارد ہے کہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے[الدنیا مزرعة الا خره اس دنیا میں باہم حقوق کی پائمالی روکنے اور حق اور سچ کا بول بالا کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم خود اپنے ساتھ دیانتدار رہیں اور دوسروں کے ساتھ بھی، چاہئے وہ دوست ہوں یا دشمن۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ہمارے اطراف میں بسنے والے سبھی عدل وانصاف کے مستحق ہیں۔ قرآن بنی نوع انسان کی رہبری مندرجہ ذیل الفاظ میں کرتا ہے۔۵

یایھاالذین امنوا کونوا قوامین بالقسط شھداء للہ ولوعلی انفسکم اوالوالدین والا قربین ج ان یکن غنیا او فقیرا فاللہ اولیٰ بھما (قف) فلا

تتبعوا الهوای ان تعدلوا وان تلووا او تعرضوا فان الله كان بما تعملون خبيراً۔"

[اے ایمان لانے والو! مضبوطی کے ساتھ انصاف پر قائم رہو اور خدا لگتی گواہی دو اگر چہ [یہ گواہی] خود تمہارے یا تمہارے ماں باپ یا قرابتداروں کے لئے مضر[ہی کیوں] نہ ہو۔ خواہ مال دار ہو یا محتاج [کیوں کہ] خدا تو تمہارے بہ نسبت ان پر زیادہ مہرباں ہے تم تو [حق سے] کترانے میں خواہش نفسانی کی پیروی نہ کرو اور گھما پھرا کے گواہی دو گے یا بالکل انکار کرو گے تو یاد رہے جیسی کرنی ویسی بھرنی [کیونکہ] جو کچھ تم کرتے ہو خدا اس سے خوب واقف ہے]

اسی عدل وانصاف کو بروئے کار لاتے ہوئے ہمیں دنیا میں جینا چاہئے اور اکل حلال کماتے ہوئے آخرت کے گھر کی تمنا کرنا چاہئے۔ ارشاد قرآنی ہے ؎

وابتغ فيما اتك الله الدار الاخرة ولاتنس نصيبك من الدنيا واحسن كما احسن الله اليك ولاتبغ الفساد فی الارض ان الله لا يحب المفسدين۔

[اور جو کچھ خدا نے تجھے دے رکھا ہے اس میں آخرت کے گھر کی بھی جستجو کر اور دنیا سے جس قدر تیرا حصہ ہے، مت بھول جا اور جس طرح خدا نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے تو بھی اوروں کے ساتھ احسان کر۔ اور روئے زمین میں فساد کا خواہاں نہ ہو، اس میں شک نہیں کہ خدا فساد کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا]

مندرجہ بالا آیات بنی نوع انسان کو روشن خیال اور انصاف پرور بنے رہنے کا درس دیتی ہیں کیونکہ اللہ مفسدین کو دوست نہیں رکھتا۔

حضرت علیؑ نے ارشاد فرمایا ہے "مبارک ہیں وہ لوگ جن کا نفس مطیع ہو گیا جن کا عمل نیک ہے اور باطن پاک ہے، ان کا نتیجہ اچھا ہے اور جنہوں نے اپنے مال کا بقیہ حصہ [راہ خدا میں] صرف کیا، زبان سے شرف حاصل کیا، اپنے نقصان کو لوگوں [تک پہونچنے] سے روک لیا [یعنی کسی کو نقصان نہیں پہونچایا] سنت [نبیؐ] دشوار نہ سمجھی اور بدعت سے رشتہ نہ جوڑا۔" ۷

اس طرح یہ سمجھنا مشکل نہ ہو گا کہ اسلام عدل وانصاف پر زور دیتا ہے اور الوہی اقدار پر مبنی عادلانہ نظام کی تشکیل کرتا ہے۔ وہ لوگ جو عدل و انصاف کا حکم دیتے ہیں، ان کے لئے حضرت علیؑ نے اپنے ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا ہے:

"...کچھ اہل ذکر ہوتے ہیں جنہوں نے یاد الٰہی کو دنیا کے بدلے میں لے لیا۔ انہیں نہ تجارت اس سے غافل رکھتی ہے نہ خرید و فروخت، اسی کے ساتھ [یہ لوگ] زندگی کے دن بسر کرتے ہیں اور محرمات الٰہیہ سے متنبہ کرنے والی آوازوں کے ساتھ غفلت شعاروں کے کانوں میں پکارتے ہیں۔ عدل وانصاف کا حکم دیتے ہیں اور خود بھی اس پر عمل کرتے ہیں۔ برائیوں سے روکتے ہیں اور خود بھی اس سے باز رہتے ہیں۔ گویا کہ انہوں نے دنیا میں رہتے ہوئے آخرت تک منزل کو طے کر لیا...." ۸

مندرجہ بالا بیان کی روشنی میں جسے نہج البلاغہ سے اخذ کیا گیا ہے، ان انسانوں کا اور ان کے اچھے اور پاکیزہ اقدامات کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو خوف خدا دل میں رکھتے ہیں اور راسخ العقیدہ افراد ہیں کیونکہ اگر عقیدہ اور عمل میں تال میل نہ ہو تو انسان ظلم واستبداد دھوکہ دھڑی کا مرتکب ہو کر سماجی اور اقتصادی عدل کے تقاضوں کی اندیکھی کرنے لگے گا۔

قرآن کریم انسانوں کو استحصال کرنے اور استحصالی قوتوں کے آگے سرنگوں ہونے سے منع کرتا ہے چاہے یہ علم اور پیشہ ورانہ مہارت ہی کی وجہ سے کیوں نہ ہوں۔ کیوں کہ یہ تمام خصوصیات توانسان کو خالق ہی نے عطا کیے ہیں اس لئے ہر ایک کو خلق خدا کے ساتھ صلہ رحم سے پیش آنا چاہئے اور ترقی اور کامیابی کی نئی منزلوں کو سر کرنے پر خدا کے سامنے سرنگوں ہونا چاہئے، سجدہ شکر کرنا چاہئے۔ یہ خیال دل میں ہرگز ہرگز نہ گزرنے پائے کہ جو کچھ حاصل ہو رہا ہے وہ صرف اس کی ذات کی وجہ سے ہے کیونکہ قرآن میں حضرت موسیٰ کے زمانے میں قارون کا ذکر موجود ہے۹

قال انما اوتیته علیٰ علم عندی اولم یعلم ان اللّٰہ قد اھلك من قبله من القرون من ھو اشد منه قوۃ واکثر جمعاً۔ولا یسئل عن ذنوبھم المجرمون۔

[تو قارون] کہنے لگا کہ یہ [مال و دولت] تو مجھے اپنے علم [کیمیا] کی وجہ سے حاصل ہوا ہے۔ کیا قارون نے یہ بھی خیال نہ کیا کہ اللہ اس سے پہلے ان لوگوں کو ہلاک کر چکا ہے جو اس سے قوت اور جمعیت میں کہیں بڑھ چڑھ کے تھے اور گنہگاروں سے (ان کی سزا کے وقت)ان کے گناہوں کی پوچھ گچھ نہیں ہوا کرتی]

ان امیر لوگوں کو جنہیں اللہ نے جسمانی اور ذہنی قوتوں سے مالامال کیا ہے اور جن کے پاس پیشہ ورانہ صلاحیتیں ہیں، اللہ کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ یہ سب لوگ اسی کے کرم کی وجہ سے معاشرہ میں سربلند نظر آتے ہیں اور عزت واقتدار پاتے ہیں۔ انہیں جائز اور ایماندار روزی کمانے کے ساتھ ساتھ محتاجوں اور قلاشوں کا حق بھی ادا کرتے رہنا چاہئے۔

حضرت علیؑ کا قول ۱۰ انسانوں کی رہبری اس طرح کرتا ہے کہ "یہ محتاج خدا

کے قاصد ہیں جس نے انہیں نہ دیا اس نے خدا کو نہ دیا اور جس نے انہیں دیا اس نے خدا کو دیا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ نعمتوں پر خدا کا شکر ادا کرنے کے لئے انہیں غریبوں اور ضرورتمندوں کی امداد کر کے ان کے دکھ درد کو بانٹنا چاہئے ورنہ وہ اپنی ذمہ داری سے پہلو تہی کرتے ہوئے نظر آئیں گے۔ علامہ اردبیلی نے تشریح کرتے ہوئے فرمایا ہے:

"انہیں اپنے دست نگر افراد کو اپنی دولت میں سے کچھ حصہ دینا چاہئے تا کہ اشیاء [ضرورت] اور لباس میں آقا اور غلام ایک سے ہوں"

ابوذر غفاری کے لئے بیان کیا جاتا ہے کہ پیغمبرؐ سے یہ سننے کے بعد کہ "تمہارے غلام تمہارے بھائی ہیں انہیں وہی لباس عطا کرو جو تم زیب تن کرتے ہو، انہیں وہی سامان دو جو تم خود استعمال کرتے ہو اور انہیں ویسا ہی کھلاؤ جیسا تم خود کھاتے ہو۔" لوگوں نے ان کے اور ان کے غلاموں کے مابین ملبوسات میں کوئی فرق نہیں پایا۔

قرآن کی آیت فبای آلآء ربکما تکذّبان [تم اللہ کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے] ان لوگوں کے لئے تازیانہ عبرت بھی ہے کہ جو محروم افراد (Have-nots) کو خدا کی دی ہوئی نعمتوں میں سے کچھ عطا نہیں کرتے۔ قرآن اور حدیث درس مساوات دیتے ہیں۔ ابوذر غفاری کے حوالے سے ایک حدیث کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ ایک اور بیان اس حقیقت کو اور واضح کرتا ہے حضرت علیؑ جب بھی لباس خریدتے تھے تو بہتر لباس اپنے غلام قنبر کو عطا کرتے تھے اور خود معمولی لباس اپنے لئے منتخب فرماتے تھے۔ اور وہ بھی اس طرح کہ احساس غلامی و مفلوک الحالی نہ ہو اور قنبر کو کچھ محسوس نہ ہو۔ ایسے مواقع پر آپ فرماتے تھے کہ قنبر تم جوان ہو تمہیں یہی لباس زیب دیتا ہے۔

یہ کائنات اللہ نے انسان کے لئے خلق کی ہے اور یہ کہ والارض مددنها

والقينا فيها رواسي وانبتنا فيها من كل شئي موزون .وجعلنالكم فيها معايش ومن لستم له برزقين [اور زمین کو [بھی اپنے مخلوقات کے رہنے سہنے کو] ہم ہی نے پھیلایا اور اس میں [میخ کی طرح] پہاڑوں کے لنگر ڈال دئے اور ہم نے اس میں ہر قسم کی مناسب چیز اگائی اور ہم ہی نے انہیں تمہارے واسطے زندگی کے سازوسامان بنادئے [اور جانوروں کے لئے بھی] جنہیں تم روزی نہیں دیتے۔[11]

نہج البلاغہ میں حضرت علیؑ کے یہ گراں قدر الفاظ ملتے ہیں جو ہمارے لئے مشعل راہ ہیں۔ آپ نے فرمایا ہے "دنیا سے خدا جو دے دے وہ لے لو] جو [مال] تم سے منھ پھیرے تو تم بھی ادھر نہ دیکھو اور اگر یہ نہ کرو تو کسب معاش میں اچھا راستہ اختیار کرو [جائز و مباح] [12] کیونکہ کوئی شخص بھی استحصال اور ظلم کے ذریعہ نہ تو حقیقی فلاح و بہبود پاسکتا ہے اور نہ ہی ترقی حاصل کرسکتا ہے۔ اس امر میں قرآن یہ کہکر انسانوں کی رہبری کرتا ہے کہ:

يايهاالناس كلوا مما فى الارض حللا طيبا ولا تتبعوا خطوات الشيطن .انه لكم عدو مبين۔

اے لوگو! جو کچھ بھی زمین میں ہے اس میں سے حلال و پاکیزہ چیز [شوق سے] کھاؤ اور شیطان کے قدم بقدم نہ چلووہ تو تمہارا ظاہر بظاہر دشمن ہے] [13]

لہٰذا ہر فرد پر لازم ہے کہ وہ اپنے عقائد وافکار اور اقدامات کی روشنی میں ایک بہترین مکمل اور صاف ستھری زندگی گذارنے کے لئے ہمہ وقت کوشاں رہے۔ جو احکامات پر عمل نہیں کرتے انہیں قرآن کی مندرجہ ذیل آیت پر غور و فکر کرنا چاہئے۔[14]

كلوا من طيبت مارزقنكم ولا تطغوا فيه فيحل عليكم غضبى ، ومن

یحلل علیه غضبی فقد هویٰ ۔[ہم نے جو پاک وپاکیزہ روزیاں تمہیں دے رکھی ہیں اس میں سے کھاؤاور پیؤ اور اس میں [کسی قسم کی]شرارت نہ کروورنہ تم پر میرا غضب نازل ہو جائیگااور[یادرکھو] کہ جس پر میرا غضب نازل ہوا تووہ یقیناً گمراہ وہلاک ہوا]

اور حضرت علیؑ نے ارشاد فرمایا ہے کہ ''کسی گھر میں لوٹ[کی ایک اینٹ یا] پتھر ویرانے کے ہاتھ رہن ہے۔ حرام مال کی تعمیر مٹ کے رہے گی۔'' ۱۵اور یہ کہ ''ایک حریص شخص اپنے کو ہمیشہ ذلت[ورسوائی] کی زنجیروں میں[جکڑاہوا]پائے گا۔''

قرآن کریم حکم دیتا ہے کہ ۱۶'' وانفقوا من مارزقنکم من قبل ان یاتی احدکم الموت فیقول رب لولااخرتنی الیٰ اجل قریب ، فاصدق واکن من الصلحین۔

[اور ہم نے جو کچھ تمہیں دیا ہے اس میں سے [خدا کی راہ میں خرچ کرڈالو] قبل اس کے کہ تم میں سے کسی کو موت آجائے تو[اس کی نوبت نہ آئے کہ] کہنے لگے کہ پروردگار تو نے مجھے تھوڑی سی مہلت اور کیوں نہ دی تاکہ خیرات کرتااور نیکوکاروں میں سے ہو جاتا]

اس کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ قادر مطلق کے عذاب سے بچنے کے لئے ہر طرح کی خرد برد سے احتراز کیاجائے۔ قرآن حکم دیتا ہے:۱۷

یایھاالذین امنوا لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل الا ان تکون تجارۃ عن تراض منکم۔"

[اے ایمان لانے والو! آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاجایا کرو، لیکن [ہاں] تم لوگوں کی باہمی رضامندی سے تجارت ہو[اور اسی میں ایک دوسرے کا مال ہو تو

کوئی مضائقہ نہیں۔]

ایک حدیث میں پیغمبرؐ آخرالزماں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ

"اے لوگو! اللہ نے تم میں سے ہر ایک کے لئے گذر بسر کے لئے ایک حصہ مقرر فرمایا ہے [اور] ہر ایک کو اس کا حصہ ملے گا اس لئے ہر فرد کو چاہئے کہ وہ اپنی گزر بسر کے لئے [روزی کا] حصہ حاصل کرنے کے لئے اچھے اور ایماندارانہ طریقہ کار کو اپنائے۔"

اسی طرح حضرت علی علیہ السلام نے اپنے ایک خطبے میں ارشاد فرمایا ہے کہ

"اللہ نے ہر فرد پر یہ ذمہ داری عائد کردی ہے کہ وہ اپنے [نیک] مقاصد کے حصول کے لئے جائز طریقے اپنائے۔ یہی اس کا حکم ہے"

لہٰذا لوگوں کو قرآن کے مندرجہ ذیل پیغام کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے۔ تلك الدار الآخرة نجعلها للذين لا يريدون علوا فى الارض ولا فسادا ۔ والعاقبة للمتقين۔

[آخرت کا گھر تو ہم انہیں لوگوں کے لئے خاص کردیں گے جو زمین پر نہ سرکشی کرنا چاہتے ہیں اور نہ فساد اور [سچ بھی یوں ہی ہے کہ] پھر انجام پرہیزگاروں ہی کا ہے]

مندرجہ بالا بیان کی رو سے اسلام ایک مکمل سماجی اور اقتصادی نظام عدل وانصاف اور بہترین معاشرہ کی تشکیل اور اس کی حیات کا ضامن ہے۔ دوسروں کے حقوق کی پایمالی اس خیال کے تحت بھی کہ میں خود دوسروں سے بہتر ہوں،۔ منع کی گئی ہے۔ ایک حدیث میں وارد ہے کہ

"وہ لوگ جو پاکیزہ ذرائع سے [دیانتدارانہ طور ہی پر سہی] دولت کماتے ہیں

[دوسروں پر فوقیت حاصل کرنے کے خیال سے اور]ڈینگیں مارنے کے لئے[تو ایسے لوگ] اللہ کے غیض و غضب سے دوچار ہوں گے۔"۱۹

امیروں کو دی جانے والی عزت جس کے وہ مستحق نہ ہوں اور اس کے نتیجہ میں مرتب ہونے والے سماجی اور اقتصادی اثرات سے بچنے کی خاطر اسلام اس طرح کے رویہ کی اجازت ہی نہیں دیتا۔"لوائے الاخبار" کے حوالے سے ایک حدیث میں وارد ہے کہ

"اللہ کی لعنت ہو اس پر جو امیر کی عزت صرف اس کی دولت کی وجہ سے کرتا ہے[کیونکہ]ایسا رویہ تو ایک منافق کا ہوتا ہے"۲۰

امراء اور غرباء دونوں کو یہ ذہن نشین رکھنا چاہئے کہ برتری اور عزت تو اس کو حاصل ہوتی ہے جو نیکوکار ہوتا ہے اور اللہ سے ڈرتا ہے، اس کے بندوں کے حقوق ادا کرتا ہے۔یہی تو ہیں وہ لوگ جو عزت کے مستحق ہیں۔ لیکن "اگر امیر فروتنی سے غریب کی عزت کرتا ہے۔تو[اس کا یہ عمل]اللہ کی برکتوں کا باعث ہے مگر اس سے بھی بہتر ہے یہ عمل کہ امیر کے سامنے غریب اپنی عزت نفس کا خیال رکھے"۲۱

ابوذر غفاری سے بیان کیا ہے کہ "میں نے پیغمبرؐ کے پاس سلمان اور بلال کو آتے دیکھا۔ سلمان پیغمبرؐ کے پائے مبارک کو بوسہ دینے کے لئے جھکے تو آپ نے یہ کہہ کر منع فرمایا کہ اس طرح ان کی عزت نہ کی جائے کیونکہ وہ اللہ کے بندوں میں سے ایک ہیں۔"

سماجی اور اقتصادی انصاف:احکامات اور اقدامات

حضرت علیؑ نے اپنے ایک مکتوب میں مصر کے نامزد گورنر مالک اشتر کی رہبری یہ کہہ کر کی کہ:

"حق کسی کے خلاف پڑے اس پر حق ضرور نافذ کرنا چاہئے، چاہے تمہارا عزیز

قریب ہو یا غیر، اس بارے میں میں تمہیں مضبوط اور ثواب خداوندی کا آرزومند رہنا ہوگا۔ حق کا وار خود تمہارے رشتہ داروں اور عزیز ترین مصاحبوں ہی پر کیوں نہ پڑے تمہیں خوشدلی سے گوارا کرنا ہوگا...."

آئمہ برحق کی ذمہ داریوں اور محترم افراد کے حقوق کو سمجھنا ہے تو اس واقعہ پر غور کرنا چاہئے کہ ایک بار ایک تاجر عاصم نے حضرت علی علیہ السلام سے اپنے بھائی کی شکایت کی کہ اس نے رہبانیت کی زندگی گزارنا شروع کر دی ہے۔ امام نے اسے سمجھایا۔ اور جب عاصم کا بھائی لاجواب ہو گیا تو اس نے کہا کہ آپ کا لباس بھی تو معمولی ہے اور آپ کی غزا بھی معمولی ہوتی ہے تو امام نے ارشاد فرمایا کہ میری تیری برابری نہیں ہے کیونکہ اللہ نے امام برحق سے عہد ومیثاق لے لیا ہے کہ اس کا معیار زندگی عوام سے پست ترین طبقہ کے معیار زندگی کے برابر ہوگا۔ لہٰذا جب تک میں ان کا معیار زندگی بلند نہیں کر لیتا اپنا معیار زندگی نہیں بلند کر سکتا۔ یہ بات رہتی دنیا تک حکمرانوں، وزیروں اور رہبروں کے کانوں سے ٹکراتی رہے گی اور ضمیر انسانی کو ذمہ داریوں کے دریچوں پر نظر رکھنے کو کہتی رہے گی۔

یہ مفلوک الحال اور بے سہارا افراد ہیں جن کے حقوق اکثر پائمال ہوتے رہتے ہیں۔ دراصل کسی بھی نظام حکومت اور منشور کی کامیابی ان کی خوشحالی اور ترقی کی کسوٹی پر بھی پرکھی جانی چاہئے۔ حضرت علی علیہ اسلام نے مالک اشتر کو تحریر فرمایا۔

"پھر اللہ اللہ! ادنیٰ طبقے کے معاملے میں۔ یہ لوگ وہ ہیں جن کا کوی سہارا نہیں ہے، فقیر مسکین، قلاش، اپاہج۔ ان میں ایسے بھی ہیں جو ہاتھ نہیں پھیلاتے مگر خود صورت سوال ہیں۔ ان لوگوں کے بارے میں جو فرض خدا نے تمہیں سونپا ہے، اسپر نگاہ رکھنا۔ اسے

تلف نہ ہونے دینا بیت المال میں ایک حصہ ان کے لئے خاص کر دینا۔" ۲۲

"ان میں ایسے بھی ہوں گے جو تمہارے پاس پہونچ نہیں سکتے۔ انہیں نگاہیں ٹھکراتی ہیں اور لوگ ان سے گھن کھاتے ہیں۔ ان کی خبر گیری بھی تمہارا کام ہے، ان کے لئے بھروسے کے آدمیوں کی خدمات خاص کر دینا مگر یہ آدمی ایسے ہوں جو خوف خدا رکھتے ہوں اور دل کے خاکسار ہوں۔ یہ لوگ ان بے کسوں کے معاملات تمہارے سامنے لایا کریں اور تم وہ کرنا کہ قیامت کے دن اللہ کے سامنے تمہیں شرمندہ نہ ہونا پڑے۔ یاد رکھو رعایا میں ان غریبوں سے زیادہ انصاف کا مستحق کوئی نہیں ہے۔" ۲۳

ملک میں انصاف قائم کرنے والے افراد کی ذمہ داری کے ساتھ ساتھ ان کے اوصاف لیاقت اور استعداد کو مد نظر رکھنا بھی ضروری ہے۔ لہذا حضرت علی علیہ السلام نے مالک اشتر کو یہ بھی لکھ بھیجا کہ:

"پھر ملک میں انصاف قائم کرنے کے لئے ایسے لوگوں کا انتخاب کرنا جو تمہاری نظر میں سب سے افضل ہوں، ہجوم معاملات سے تنگ دل نہ ہوتے ہوں۔ اپنی غلطی پر اڑے رہنا ہی ٹھیک نہ سمجھتے ہوں اور حق کے ظاہر ہونے کے بعد باطل سے چمٹے نہ رہتے ہوں۔ طماع نہ ہوں۔ اپنے فیصلوں پر غور کرنے کے عادی ہوں۔ فیصلے کے وقت شکوک و شبہات پر رکنے والے ہوں۔ صرف دلائل کو اہمیت دیتے ہوں۔ مدعی اور مدعا علیہ سے بحث میں اکتا نہ جاتے ہوں۔ واقعات کی تہہ تک پہنچنے سے جی نہ چراتے ہوں۔ اور حقیقت کھل جانے پر اپنے فیصلے میں بے باک اور بے لاگ ہوں۔ یہ ایسے لوگ ہوں جنہیں نہ تعریف بے خود کر دیتی ہو، نہ چاپلوسی ہی مایل کر سکتی ہو" ۲۴

اس کے علاوہ اسود بن قطبہ، حاکم حلوان [ایران] کے نام ایک مکتوب میں آپ

نے اسے ہدایت کی کہ

''اگر حاکم اپنی خواہشوں پر چلنے لگے تو بہت سا انصاف اس سے رہ جائے گا۔ تمہیں ایسا ہونا چاہئے کہ حق مین سب لوگ تمہارے سامنے برابر رہیں۔ ناانصافی میں انصاف کا کوئی عیوضی نہیں ہو سکتا۔ تم ان تمام باتوں سے پرہیز کرو جو تمہیں دوسروں میں بری معلوم ہوں اور خدا نے جو کچھ تم پر فرض کر دیا ہے حتی المقدور اسے انجام دیتے رہو۔''۲۵

سرکاری رقوم کی خرد برد اور اس کے غلط استعمال سے سماجی اور اقتصادی ڈھانچے کا تانہ بانہ ٹوٹ جاتا ہے، بے ایمانی اور غیر دیانتدارانہ رویہ معاشرہ میں ناانصافی کو بڑھاوا دینے لگتا ہے۔ سارا انظام درہم برہم ہو جاتا ہے اور خود حکومت بدنام ہو جاتی ہے۔ لہٰذا حکمرانوں اور وزیروں اور افسران کو ذمہ دارانہ طور پر معاشرہ میں امن وامان کو قائم رکھنے کے لئے اور حقوق کے تحفظ کی خاطر عدل وانصاف کو قائم ودائم رکھنا چاہئے تب ہی خوشحالی اور آزادی کی ضمانت دی جاسکتی ہے۔ حضرت علیؑ نے اشعث ابن قیس کو تحریر کیا کہ

'' تمہارا یہ عہدہ کوئی خوان نعمت نہیں ہے بلکہ تمہارے گلے میں امانت ہے اور تم بالادست حاکم کے سامنے جواب دہ ہو۔

تمہارے ہاتھ میں جو مال ہے وہ خدا کا ہے، تم اس کے خزانچی ہو۔''۲۶

اسی طرح زیادہ ابن ابیہ کے نام ایک خط میں امانتداری کی تاکید یہ کہہ کر کی کہ:

''میں قسم کھاتا ہوں اللہ کی سچی قسم کہ مسلمانوں کے مال میں تیری ذرا سی خیانت بھی سن لوں گا تو ایسی سختی سے پیش آوں گا کہ تو بے سر وساماں ہو کر رہ جائے گا۔''۲۷

انصاف قائم کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ افسران اعلیٰ سماجی ڈھانچے کو رشوت ستانی کی آگ سے محفوظ رکھیں اور امراء اور روساء کی چالوں میں نہ آئیں۔ ان کی

[بے جا] دعوتوں میں شریک نہ ہوں۔ کیونکہ اثر رسوخ پیدا کرنے کی غرض سے دعوتیں سماجی اور اقتصادی انصاف پر ضرب کاری لگاتی ہیں۔ حضرت علی علیہ السلام کو جب یہ معلوم ہوا کہ عثمان بن حنیف انصاری گورنر بصرہ [عراق] نے ایک معمولی شخص کی دعوت قبول کرلی تو آپ نے انہیں لکھ بھیجا۔

"...مجھے معلوم ہوا کہ بصرہ کے ایک بے فکرے نے تمہیں دعوت دی اور تم دوڑ پڑے۔ قسم قسم کے کھانے تھے۔ تم مزے لے لے کے کھاتے تھے۔ اور تمہارے آگے قابوں پر قابیں بڑھائی جارہی تھیں۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ تم ایسے لوگوں کی دعوت قبول کرو گے جن کے دروازے پر محتاج دھتکارے جاتے ہیں اور جن کے دستر خوان پر صرف مالدار بلائے جاتے ہیں۔" ۲۸

مندرجہ بالا بیان کی روشنی میں یہ بھی ضروری ہے کہ اس طرح کے احکام نافذ کرنے والے افسران بالا یا حکمرانوں کے الفاظ خود اعمال پر مبنی ہوں۔ حضرت علیؑ کی زندگی اور ان کے اقدامات "اعمال اور اقوال پر غور کریں تو ان میں کسی طرح کا کوئی تضاد نظر نہیں آئے گا۔ ایک بار آپ انبار سے مع اپنے لشکر کے گزر رہے تھے۔ عوام اور خواص ہی نے بڑھ کر انہیں خوش آمدید کہا۔ انہوں نے لشکر کے لئے گھوڑے دینے اور خود لشکر کی ضیافت کی پیشکش کی۔ حضرت علی علیہ السلام نے یہ کہہ کر منع فرمایا: "جب تم نے اپنے ٹیکس ادا کر دئے ہیں [تو] اس کے علاوہ تم سے کسی زائد وصولی ہر چند کہ تم خود سے اسے دینے کے لئے تیار ہو، حکومت کے تئیں ایک جرم [کے مانند] ہے۔" مگر جب پیشکش کرنے والوں نے اصرار کیا تو حضرت علیؑ نے ان کے گھوڑوں کو [پیشگی] ٹیکس کی صورت میں لینے کی منظوری عطا کردی اور ضیافت پر ان کے اخراجات کی ادائیگی جہاد فنڈ سے

کردی"

انصاف کی تمام تر تفصیلات کے ساتھ ساتھ حضرت علی علیہ اسلام نے یہ بھی بیان کیاہے کہ [اے مالک اشتر] "کسی [بھی] ملک کی بربادی اور زبوں حالی کی اصل وجہ اس کے عوام کی غربت ہوتی ہے [اور] عوام کی غربت کی اصل وجہ اس کے حکمرانوں اور افسران کی [وہ] ہوس ہوتی ہے جس کی رو سے وہ دولت اور املاک اکٹھا کرتے ہیں چاہے وہ جائز طریقوں سے حاصل ہو یا ناجائز طریقوں سے]"

حضرت علی علیہ اسلام کا نظریۂ عدل وانصاف قرآنی الفاظ رب العالمین اور ان کے معنی سے ہم آہنگ اور عین مطابق تھا۔ جب آپ کو معلوم ہوا کہ غیر مسلم رعایا کو ایک عہدیدار سے اس کے سخت گیر رویہ کی وجہ سے شکایت ہے تو آپ نے لکھ بھیجا:

"تمہارے علاقہ کے زمینداروں نے تمہاری سختی سنگ دلی' تحقیر' بے پروائی کی شکایت کی ہے۔ تم ایسا کرو کہ ان کے لئے نرمی کا لباس پہن لو..."

۱۹۰۳ء میں اہم دستاویز اردبیلی [آمیز ربائیجا] میں روسیوں کو دستیاب ہوئی یہ حضرت علی علیہ السلام کا ایک فرمان ہے جس کی رو سے آرمینائی عیسائیوں کو ان کی زندگی' املاک' غربت سماجی حیثیت اور مذہبی آزادی کی ضمانت دی گئی تھی اور افسران کو تاکید کی گئی تھی کہ ان سے کسی طرح کی سختی اور نازیبا سلوک محض اس وجہ سے نہ کیا جائے کہ وہ غیر مسلم ہیں۔

ایک صحت مند معاشرہ کی تشکیل اور اسکو جاری وساری رکھنے کے لئے یہ اشد ضروری ہے کہ حکمراں اور افسران اور عدلیہ سبھی دیانتداری سے کام کریں اور کسی طرح کے تعصب کے شکار نہ ہوں۔ تب ہی ملک میں انصاف قائم ہو سکتا ہے جیساکہ بیان کیا جاچکا

ہے عدلیہ اور افسران کی تقرری نہایت ہی احتیاط اور غور و غوض کے ساتھ کی جانی چاہیے۔ حضرت علی علیہ السلام نے مالک اشتر کو مصر کا گورنر بنایا تو اسی امر کی ہدایت فرمائی تھی۔

عدل اور انصاف پر قائم معاشرہ کے قیام اور استحکام کیلئے حضرت علیؑ حق و انصاف پر کتنا زور دیتے تھے 'اسبرن [OSBORNE] سے سنئے رائے دینے والوں نے علیؑ کو سمجھایا کہ بددیانت گرزوں کو جنہیں ان سے پہلے مقرر کیا گیا تھا اس وقت تک یہ برطرف نہ کریں جب تک ان کی پکڑ خود اپنے دشمنوں پر مضبوط ہو جاوے [مگر] اسلام کے اس علمبردار نے کبھی سمجھوتہ نہ کرنے والے [علیؑ] نے غلط کے مرتکب ہونے سے انکار کر دیا۔ اس شریفانہ اقدام کی قیمت انہیں اپنی حکومت اور خود ان کی جان دے کر ادا کرنی پڑی مگر علیؑ ایسے تھے جو کبھی بھی حق و انصاف سے بالاتر کسی چیز کو نہ گردانتے تھے۔" ۲۹

یقیناً علیؑ ابن ابی طالب جو مومنین کے امیر اور اسلام کے ایک مثالی عادل حکمران تھے، ایسے تھے جو سماجی واقتصادی عدل وانصاف بہم پہونچاتے تھے اور اسے عام کرنے پر زور دیتے تھے۔

حوالے :

ا۔ آیت.... محمد باقر الصدر دی اسلامک اکونامی [اقتصادی نا] ترجمہ 'سروش، نمبر ۳' مئی ۱۹۸۱' تہران، اسلامی جمہوریہ ایران

۲۔ ایضاً صفحہ ۳۳

۳۔ ایضاً صفحات ۳۵۔۳۴

۴۔ آیت... خمینی اسلامی جمہوریہ ایران کے یوم تاسیس پر تقریر '۳/اپریل ۱۹۷۹

۵۔ النساء' آیت ۱۳۵

۶۔ القصص۔ آیت ۷۷

۷۔ نہج البلاغہ [اُردو] احباب پبلشرز 'لکھنؤ' قول ۱۱۹' صفحہ ۶

٨۔ایضاً صفحہ ٦٧٧

٩۔القصص، آیت ٧٨

١٠۔ نہج البلاغہ [اُردو] قول ٢٩٧، صفحہ ٩٦٨

١١۔الحجرات آیت ٢٠-١٩

١٢۔ نہج البلاغہ [اُردو] قول ٣٨٨ صفحہ ٩٨٨

١٣۔بقرہ آیت ١٩٨

١٤۔ طہٰ آیت ٨١

١٥۔ نہج البلاغہ [اُردو] قول ٢٣٢ صفحہ ٩٤٩

١٦۔التغابن آیت ١٠

١٧۔النساء آیت ٢٩

١٨۔القصص آیت ٨٣

١٩۔اصول کافی جلد ٢ صفحہ ٣٠٧

٢٠۔ایضاً صفحہ ٣٧٨

٢١۔ بحار الانوار

٢٢۔ نہج البلاغہ اردو صفحہ ٨٣٤

٢٣۔ایضاً صفحہ ٨٣٥

٢٤۔ایضاً صفحات ٨٣٠-٨٢٩

٢٥۔ایضاً صفحہ ٨٤٩

٢٦۔ایضاً صفحہ ٧٣٠

٢٧۔ایضاً صفحہ ٧٤٦

٢٨۔ایضاً صفحہ ٨٠٤

29.ISLAM UNDER THE PROTECTION OF ARABS

☆☆☆☆

مسلمانوں کے خلاف موجودہ پروپگنڈہ مہم کی منصوبہ بندی

درحقیقت صہیونیوں کی ایجاد ہے

از: مقام معظم رہبری آیت اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای

۱۱ر ستمبر ۲۰۰۱ء کو امریکہ میں رونما ہونے والے انسانیت سوز حوادث نے پوری دنیائے بشریت کو لرزہ براندام کردیا۔ ان حوادث کے دوران ہزاروں بے گناہ لوگ مارے گئے، ہزاروں افراد زخمی ہوئے اور لاکھوں ڈالر کا مالی نقصان بھی ہوا۔ دنیا کے دیگر ممالک کی طرح اسلامی جمہوریہ ایران نے بھی دہشت گردی پر مشتمل اس واقعہ کی بھرپور مذمت کی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اس جانگداز واقعہ سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف پروپگنڈہ مہم چلانے والوں کی نشاندہی بھی فرمائی۔ ذیل میں ان کے ارشادات کے کچھ حصے حاضر خدمت ہیں۔ (ادارہ)

اسلامی انقلاب کے رہبر عظیم الشان حضرت آیت اللہ سید علی خامنہ ای نے ایرانی یونیورسٹیوں میں شیعہ معارف اسلامی کے دائرکٹروں اور دیگر ذمہ دار لوگوں کو خطاب

کرتے ہوئے فرمایا کہ بیگناہوں کا قتل عام چاہے وہ دنیا کے کسی گوشے میں رونما ہو یقیناً ایک مذموم حرکت ہے۔ اسلام کی نظر میں خالی ہاتھ بے گناہوں کا قتل عام ایک ظالمانہ عمل ہے۔ جس کی سخت لفظوں میں تردید و مذمت کی جانی چاہئے چاہے یہ قتل عام مسلمانوں کا ہو یا عیسائیوں یا دیگر قوموں کا نیز چاہے اس قتل عام میں ایٹم بم کا استعمال کیا گیا ہو یا میکروبک اسلحوں یا دوسرے قسم کے اسلحوں کا اور چاہے یہ قتل عام ہیروشیما یا ناگاساکی یا صبرا و شتیلا یا بوسنی ہرزگوونیا، یا عراق یا نیویارک یا واشنگٹن میں، بہر حال بے گناہوں کے قتل عام کی بھرپور مذمت کی جانی چاہئے۔

اپنی گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے آیت اللہ خامنہ ای نے زور دیتے ہوئے مزید فرمایا کہ **اسی اصول کو نگاہ میں رکھتے ہوئے وہ افغانستان کے خلاف ممکنہ فوجی کارروائی کی بھی مذمت کرتے ہیں جس کے نتیجے میں دوسرا انسانیت سوز حادثہ رونما ہو سکتا ہے۔** انہوں نے کہا کہ عالمی سطح پر دہشت گردی کی مذمت کرتے ہوئے کسی قسم کا امتیاز، بھید بھاؤ یا جانب داری قطعی جائز نہیں ہے۔ انہوں نے تعجب آمیز لہجے میں فرمایا کہ "آخر دنیا نے مقبوضہ فلسطین میں رونما ہونے والی ظالمانہ حرکتوں کے سلسلے میں اپنی آنکھیں کیوں بند کر رکھی ہیں اور صہیونی عناصر کی ان حادثہ آفرینیوں کے سلسلے میں ان پر سکوت کیوں طاری ہے۔ اس کے بعد اسلامی انقلاب کے قائد عظیم الشان آیت اللہ سید علی خامنہ ای نے صہیونی جلادوں کے ذریعہ موجودہ اسلام اور مسلمان دشمن ماحول کے ناجائز استعمال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے

فرمایا کہ صہیونی جلادوں نے فلسطینی مظلوموں پر اپنے وحشیانہ مظالم میں غیر معمولی اضافہ کر دیا ہے لہذا موجودہ حالات میں مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ وہ صہیونی ظالموں کے ذریعہ حوادث کے ناجائز استعمال اور ان کی ظالمانہ راہ وروش کے خلاف آواز بلند کریں۔

انہوں نے ان حوادث کی وجہ سے امریکہ کی داخلی امن وسلامتی کو جو غیر معمولی نقصان پہونچا ہے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ

"یقیناً یہ بات انتہائی حیرت انگیز ہے کہ جو ملک "عالمی گاؤں" کی چودھراہٹ کا اکلوتا دعویدار ہے وہی دنیا کے خطرناک ترین دہشت گردوں کی پناہ گاہ بھی ہے۔"

انہوں نے بڑی طاقتوں کی زیادتی اور ہوس پرستی کو ان کے لئے عظیم نقصانات کا باعث قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ امریکہ میں رونما ہونیوالے موجودہ حوادث کی بنیادی وجہ پوری دنیا میں اس کی وسعت پسندانہ سیاستوں میں پوشیدہ ہے۔ اگر اس ملک نے ان سیاسی ہتھکنڈوں سے علحدگی اختیار کر لی ہوتی اور ملک کے اندرونی وداخلی امور کی طرف خاطر خواہ توجہ کی ہوتی تو اس قسم کے حوادث ہر گز رونما نہ ہوتے۔ انہوں نے زور دیتے ہوئے فرمایا کہ **آج بھی اگر امریکہ پاکستان میں اپنی فوجی موجودگی اور افغانستان پر اپنے فوجی حملوں کے ذریعہ اس علاقے میں اپنی طاقت کا مظاہرہ کرتا ہے تو اس سے اس کی پریشانیوں میں روز بروز اضافہ**

ہو تا چلا جائے گا۔

آیت اللہ سید علی خامنہ ای نے ملت اسلامیہ افغانستان کے گذشتہ ۲۵ سالہ رنج و مصائب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ کیا فقط اس وجہ سے کہ امریکہ کے حالیہ حوادث کے کچھ ملزمین افغانستان میں پناہ گزین ہیں، ملت اسلامیہ افغانستان کو دوبارہ فوجی حملوں کا شکار بنانے کی تیاری ہے جبکہ ان واقعات میں متہم افراد کا دہشت گردانہ حوادث میں ملوث ہونا ابھی ثابت و قطعی نہیں ہے اس کے برعکس ایسے بے شمار قرائن و شواہد موجود ہیں جن کی روشنی میں اس خیال کی تقویت ہوتی ہے کہ امریکہ کے موجودہ حوادث کی منصوبہ بندی اور تعمیل میں صہیونیوں کا ہاتھ رہا ہے۔ انہوں نے زور دیتے ہوئے فرمایا کہ دہشت گردوں کے اس گروہ میں چند مسلمان افراد کی موجودگی کی وجہ سے دنیا کے عام مسلمانوں پر ظلم اور افغانستان کے عوام پر حملہ کرنا قطعی جائز و منطقی نہیں ہے۔

رہبر معظم آیت اللہ خامنہ ای نے مغربی ذرائع ابلاغ عامہ کی طرف سے اسلام اور مسلمان دشمن پروپگنڈوں اور مسلمانوں کے خلاف عالمی رائے عامہ کو بھڑکانے کی مذموم کوشش پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ آخر الزام اور اتہام کی انگلی ان مسلمانوں کی

طرف کیسے اٹھائی جاسکتی ہے جو دنیا میں بلکہ خود امریکہ میں بھی مظلوم ہیں۔اس کے علاوہ دنیاکا وہ کون سا قانون ہے جس کی روشنی میں ایک مسلمان کے خلاف لگائے گئے الزام کو جو ابھی پوری طرح ثابت بھی نہیں ہے، پوری دنیا کے مسلمانوں سے جوڑا جاسکتا ہے؟انہوں نے اپنی بات کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ آج مقبوضہ سرزمین فلسطین میں صہیونی جلاد وحشیانہ مظالم میں سرگرم ہیں۔کیااس حقیقت کو نگاہ میں رکھتے ہوئے ساری دنیا کے یہودیوں کی مزمت کی جاسکتی ہے؟انہوں نے انتہائی واضح لفظوں میں فرمایا کہ ہمارااعتقاد وایمان ہے کہ موجودہ مسلمان دشمن تبلیغاتی لہروں کی ایجاد کا منصوبہ صہیونیوں نے تیار کیا ہے کیونکہ ان لوگوں نے اسلام سے ہمیشہ چوٹ کھائی ہے۔

حضرت آیت اللہ خامنہ ای نے ناانصافی اور امتیاز وبھید بھاؤ کو موجودہ دنیا کی پریشانیوں کی بنیادی وجہ قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ اس ناانصافی اور امتیاز کا بنیادی مقصد دنیا کے دولت مند اور طاقتور انسانوں پر شیطانی خیالات وخواہشات کا تسلط اورانہیں خدا سے دور رکھنا ہے۔اوران تمام مصائب و آلام نیز بشریت کے قدیم زخموں کا علاج خداوند عالم کی بارگاہ میں واپسی اور ایمان وروحانیت کے ساتھ صلح وآشتی ہے۔

انہوں نے دنیا میں موجودہ معنوی خلائی اور موجودہ دنیا کے لئے روحانیت کی ضرورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ آج خدا کی طرف توجہ کے پرچم کو دنیا کے جس گوشے میں بھی بلند کیا جائے گا،لوگوں کی توجہ ودلچسپی کا باعث ہوگا۔

☆☆☆☆☆

☆☆